اقبال

مُدیرِ اعزازی:

ڈاکٹر وحید قریشی

نائب مُدیر:

راجہ فخر محمد ماجد

بزمِ اقبال ۔ کلب روڈ ۔ لاہور

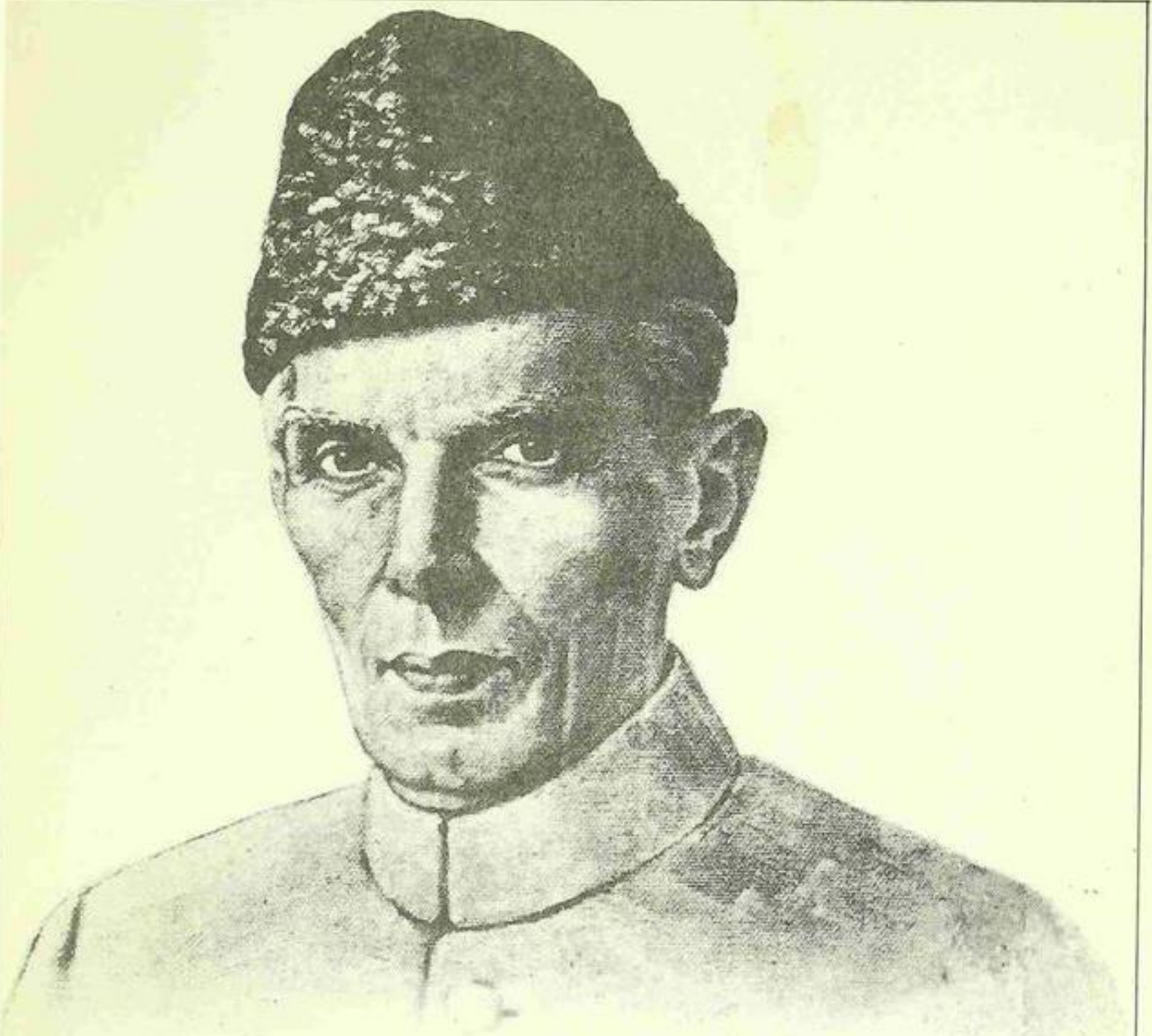

جمہوریت ہمارے خون میں ہے، ہمارے رگ وریشہ میں پیوست ہے۔ صدیوں کے ناموافق حالات نے اِس خون کی گردش کو سُست کر دیا تھا۔ یہ منجمد ہو گیا تھا اور آپ کی شریانیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ خون کی گردش دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔

قائداعظم

نیشنل بینک آف پاکستان

بہتر کارکردگی
جدید ٹیکنالوجی

UNITED

PID-I-36/89

اِقبال

بزمِ اقبال کا سہ ماہی مجلہ

جلد ۳۷ | جنوری/اپریل ۱۹۹۰ء | شمارہ ۱-۲

مُدیرِ اعزازی:
ڈاکٹر وحید قریشی

نائب مُدیر:
راجہ فخر محمّد ماجد

بزمِ اِقبال ○ لاہور

مجلّۂ اقبال

مجلہ اقبال کا مقصد علامہ اقبال کی زندگی، شاعری، افکار اور علوم و فنون کے ان شعبوں کا تحقیقی مطالعہ ہے جن سے انھیں گہری دلچسپی تھی، مثلاً اسلامیات، فلسفہ، عمرانیات، مذہب، ادب، فن وغیرہ۔

ترسیل مضامین برائے اشاعت، رسالہ جات برائے تبادلہ اور مطبوعات بغرضِ تبصرہ (دو جلدیں) بنام مدیر اقبال، ترسیل زر اور کاروباری خط و کتابت بنام معتمد، بزمِ اقبال، ۲۔ کلب روڈ، لاہور۔

سوائے ان مضامین کے جن پر وضاحت کی گئی ہو کہ ان کے حقوق صاحبِ مضمون کے ہیں، مجلہ ''اقبال'' میں مطبوعہ مضامین کے حقوق محفوظ ہیں۔ نقل کی اجازت کے لیے مدیر اقبال سے رجوع کریں۔

مضمون نگار حضرات کے افکار و آرا کی ذمہ داری مدیران یا بزمِ اقبال پر عائد نہیں ہوتی۔

اگر کسی مضمون کے ہمراہ لفافہ اور ٹکٹ نہ بھیجے جائیں تو اسے واپس نہیں کیا جاتا۔

سالانہ چندہ : ۸۰ روپے / ۲۴ ڈالر / ۱۰ پونڈ

قیمت فی شمارہ : ۲۰ روپے / ۶ ڈالر / ۵ پونڈ

موجودہ شمارہ : ۲۵ روپے

○

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
(مدیر اعزازی)
بزم اقبال ۲، کلب روڈ، لاہور

: ایس ایم اظہر رضوی
: اظہر سنز پرنٹرز،
۱۰۸، لٹن روڈ لاہور

نیشنل بینک

فہرست

		صفحہ
بھارت میں اقبالیات	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۳ ...
اقبال کی نظم "مرزا غالب" کا تخلیقی محرک	ڈاکٹر صدیق جاوید	۳۹ ...
علامہ اقبال کی ایک نادر تحریر	پروفیسر ڈاکٹر صدیق شبلی	۷۷ ...
علامہ اقبال کی نظم "موٹر"	صابر کاوروی	۸۲ ...
یوسف سلیم چشتی بطور شارح اقبال	اختر النساء	۸۹ ...
کلام اقبال کی اشاعت کی زمانی ترتیب	صابر کاوروی	۱۰۳ ...
کتابوں پر تبصرے	جعفر بلوچ ، ڈاکٹر انور مدید	
	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۱۳۵ ...
تعارف کتب بزم اقبال	ڈاکٹر غلام حسین اظہر	
	ڈاکٹر انور مدید	
	اشفاق احمد ورک	۱۵۹ ...

Iqbal in Muslim Bengal	*Dr. Syed Sajjad Husain*	... 1
Iqbal for Every One	*Rajinder Singh Verma*	... 9
Iqbal's Journey from negation to afirmation	*Nazeer Siddiqi*	... 26

ادب کے جدید ترین رجحانات کا ترجمان

ماہنامہ

جدید ادب

لاہور

☆ ادبی گروہ بندیوں سے آزاد

☆ ہر مکتب فکر کے ادیبوں کی نگارشات

☆ تازہ ترین ادبی رجحانات

☆ ادب عالم کی رفتار اور اردو ادب پر اثرات

☆ جدید سائنسی تقاضوں سے ہم آہنگ

خوبصورت ٹائپ میں ایسے بے شمار موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔

اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور منظوم تخلیقات درج ذیل پتہ پر ارسال کریں

مدیر : جدید ادب
۹ - ریٹیگن روڈ
لاہور

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی*

بھارت میں اقبالیات

جناب جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں :

"[۱۹۵۵ء] میں جناب آصف علی اصغر فیضی جموں و کشمیر یونی ورسٹی سری نگر کے وائس چانسلر تھے۔ انھوں نے مجھ سے فرمایش کی کہ میں تین لیکچر غالب کے فکر و فن پر دوں ۔ میں نے ان سے کہا کہ غالب پر بھی کبھی لیکچر دے دوں گا ، لیکن اس وقت تو مجھ سے اقبال پر لیکچر دلوائیے ۔ فیضی صاحب جیسے سناٹے میں آ گئے ۔ فرمانے لگے: ۱۹۴۷ء سے آج تک کسی نے جموں و کشمیر میں اقبال کا نام نہیں لیا ، آپ کیوں اس موضوع پر لیکچر دینا چاہتے ہیں ؟ [میں نے کچھ دلائل دے کر کہا] اس یونی ورسٹی میں اقبال پر لیکچروں کا انتظام بہت پہلے ہونا چاہیے تھا"۔ فیضی صاحب نے کہا : "آپ سوچ لیجیے ، میں بھی اس پر غور کروں گا ۔ [تین روز غور و فکر اور لیکچروں کے بارے میں وضاحتی گفتگو] کے بعد انھوں نے رسمی دعوت نامہ مجھے دے دیا"۔

بھارت میں اقبالیات کے ضمن میں ، تقسیم ہند کے بعد ابتدائی سات آٹھ برسوں میں ، ہمیں سناٹے کی وہی کیفیت نظر آتی ہے، جو اقبال پر تین لیکچروں

---

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو ، یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور ۔

کی تجویز سن کر کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر فیضی صاحب پر طاری ہوئی تھی ۔

ذکر اقبال سے گریز اور اعراض و اغماض کی یہ کیفیت ، اس صورت حال کا فطری نتیجہ تھی ، جو تقسیم ہندستان کے بعد بھارت اور کشمیر میں پیدا ہو چکی تھی ۔ عوام الناس اور سیاسی حلقوں میں اقبال کا امیج ، ایک ایسے شخص کا تھا ، جو متحدہ قومیت اور ہندستانی نیشنل ازم کے مقابلے میں ، دو قومی نظریے کا حامی ہی نہیں ، اس کا پر جوش داعی اور مبلغ بھی تھا اور جس نے ہندستان کے شمال مغربی خطے میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کی صورت گری اور اس کے لیے فضا سازگار اور زمین ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا ۔

۱۹۰۵ء کے بعد ، اقبال وطن پرستی سے دست کش ہو کر :

ع ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کے بعد :

ع مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کہنے لگے تو بہت سوں کو ان کی یہی بات پسند نہیں آئی ، چنانچہ وہی شاعری ، جو کانوں میں رس گھولتی تھی ، اب تازگیِ تخئیل اور بے ساختگیِ جذبات سے عاری نظر آنے لگی ۔ پنڈت آنند نرائن ملا جیسے حضرات شکوہ کرنے لگے :

ہندی ہونے پر ناز جسے کل تک تھا ، حجازی بن بیٹھا
اپنی محفل کا رند پرانا ، آج نمازی بن بیٹھا

محمل میں چھپا ہے قیسِ حزیں، دیوانہ کوئے صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا ، اقبال وہ اب دنیا میں نہیں

اے مطرب تیرے ترانوں میں اگلی سی اب وہ بات نہیں
وہ تازگیِ تخئیل نہیں ، بے ساختگیِ جذبات نہیں[۲]

معروف ادیب اور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی نے ایک بار اپنی خفگی کا

اظہار یوں فرمایا :

''اقبال کا کلام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت جذباتی انسان تھے ۔

ع خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس کے بعد دیوتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا''۔

کچھ اور پیچھے چلیں تو اقبال سے اہلِ بھارت کے شکوہ و شکایت کی وجہ سمجھ میں آتی ہے ۔ ۱۹۳۰ء میں اقبال نے خطبۂ الہ آباد پیش کیا ، تو اس پر بعض ہندو اخباروں نے شدید ردِ عمل ظاہر کیا ۔ ''پرتاب'' نے علامہ کو ''شمالی ہند کا ایک خوفناک مسلمان'' قرار دیتے ہوئے ، ان کی '' گستاخیوں'' کے جواب میں لکھا :

''وہ شاعر ہے ، نہ فلاسفر ہے ، نہ محبِّ وطن ہے ۔ وہ ایک تنگ خیال ، تنگ نظر ، انتہا درجے کا متعصب مسلمان ہے''[۴]۔

''ملاپ'' (۱۱ جنوری ۱۹۳۱ء) ہی میں لالہ دینا ناتھ کے مندرجہ ذیل اشعار شائع ہوئے :

اقبال نے کی آ کے ، مرے پاس التجا
کچھ وجہ ہی تو چاہیے مجھ پر عتاب کی

میں نے کہا کہ شوخ ہو ، گستاخ ہو بہت
تم نے تو پالیٹکس کی مٹی خراب کی

ہندو پہ تم نے راج مسلماں کا مانگ کر
''ہاہوش میں لگائی کرن آفتاب کی''[۵]

اپنی نظم کے حوالے سے انھوں نے یہ تبصرہ بھی کیا :

''اقبال ہندوؤں جیسی دانش مند اور طاقت ور قوم کا کیا بگاڑ سکتا ہے''[۶]۔

یہ سوچ فقط ایک متعصب ذہن کا کرشمہ ہے ، ورنہ اقبال کسی مذہب یا قوم کے خلاف نہ تھے ۔ وہ اپنی ملت کے حق میں ضرور تھے اور مسلمانوں کے زوال اور پستی پر مضطرب رہتے اور ان کی سربلندی کے لیے تدبیریں بھی سوچتے ، خطبۂ الہ آباد میں اسلامیانِ ہند کے اصلاحِ احوال کے لیے ایک تجویز

اوش کی گئی تھی ۔ اس سے یہ مفہوم اخذ کرنا کہاں کی ''دانش مندی'' ہے کہ وہ ہندوؤں جیسی ''طاقتور قوم کا کچھ بگاڑنا'' چاہتے تھے ۔ اقبال تو ہندوؤں سمیت ، تمام ابنائے وطن کے ہمیشہ ہی خواہ رہے ۔ ان کے مخالف نقادوں کے سرگروہ فراق گورکھپوری بھی معترف ہیں :

''یہ اقبال کی عظمت ہے کہ وہ کبھی بھی کسی سستے معنوں میں ہندو دشمن نہیں تھے اور نہ ہوئے''۔

بہرحال ۱۹۴۷ء کے بعد ، اقبال سے بھارت کی بے لیازی و بے اعتنائی کے اسباب کا سلسلہ ماضی میں بہت دور تک جاتا ہے — فی الوقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے ۔ یوں بھی اس کا تعلق ادب سے زیادہ تاریخ اور سیاست سے ہے ۔

تقسیم عظیم کے موقع پر ڈاکٹر سنہا کی انگریزی کتاب Iqbal : The Poet and His Message اور مجنوں گورکھپوری کی ''اقبال (اجمالی تبصرہ ۹)'' شائع ہوئیں ۔ سنہا صاحب نے بعض پہلوؤں سے اقبال کی تعریف کی، مگر مجموعی حیثیت سے یہ اقبال مخالف کتابوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے ۔ انھوں نے اقبال کے نظریۂ ملت پر نکتہ چینی کی ہے ۔ حافظ اور تصوف پر اقبال کی تنقید انھیں پسند نہیں ۔ انھیں یہ بھی شکوہ ہے کہ اقبال نے زیادہ تر شاعری ، ایک غیر ملکی زبان (فارسی) میں کی اور یہ کہ انھیں زبان و ادب اور افکار و عقائد کے لحاظ سے ہندوستان سے زیادہ دلچسپی نہ تھی ۔ ڈاکٹر سنہا ، اپنی کتاب کے اس باب میں ، اقبال پر ''خاصے نامہربان۱۰'' نظر آتے ہیں ۔ یہاں انھوں نے اقبال کو صفِ اول کے شعراء کی صف میں شامل کرنے سے انکار کیا ہے کیوں کہ اقبال کے ہاں ''آفاقیت اور ہم آہنگی کا فقدان'' ہے ۔ (ص ۲۴۰) اقبال ایک عظیم شاعر اس لیے نہ بن سکے کہ ان کی شاعری پر مذہبیت نے غلبہ پا لیا تھا (ص ۲۴۴) ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ یہ کتاب ''ہندو مسلم نزاعات کے اثرات سے بری طرح متاثر۱۱'' ہوئی ہے ۔ سنہا صاحب اپنے ایک قریبی دوست ، پروفیسر سیّد اقبال حسین کے بقول : ''تقسیمِ ہند کے سخت مخالف تھے۱۲'' اس لیے اقبال سے ان کی ناراضی ایک قدرتی بات تھی ۔

مجنوں گورکھپوری نے بہ طورِ شاعر اقبال کی تعریف کی ، مگر ان کے خیال میں یہ شاعری تنگ نظری ، ماضی پرستی، غلط فکری میلانات اور ''سستے قسم کی ملیت اور اسلاف پرستی'' کی حامل ہے ، اس میں تقاضے ہیں ۔ اقبال کی آفاقیت کو، انھوں نے ''ایک قسم کی فراریت (Escapism)'' قرار دیا ۔ مجنوں

صاحب نے شاعرِ مشرق کی ''حجازیت'' اور اس سے زیادہ ان کی ''عقابیت'' اور ''فاشیت'' پر بھی تشویش کا اظہار کیا ـــــ ایک ''اسلامی مفکر''، ''مصورِ پاکستان'' اور ''ملی ہیرو'' کے حوالے سے اقبال کے خلاف صحافیانہ پراپیگنڈے کے زیادہ تر اثرات عوام الناس نے قبول کیے تھے۔ ہندوؤں میں عام خیال یہ تھا کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد پر ہے[۱۳]۔ اب سنہا اور فراق کی تحریروں نے خواص (شاعروں، ادیبوں، دانش وروں اور تعلیم یافتہ طبقوں) کو متاثر کیا۔ ڈاکٹر سنہا کی سماجی حیثیت بلند تھی۔ وہ ۱۸۹۷ء کے بیرسٹر ایٹ لا تھے۔ دس سال تک امپیریل کونسل کے رکن رہے، پھر آٹھ برس پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔ برسوں ہندستان کے مختلف سیاسی اور انتظامی اداروں سے منسلک رہے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری نامور ترقی پسند ادیب اور معتبر نقاد تھے۔ ان کے مسلمہ ادبی رتبے کے پیشِ نظر، ان کی تحریروں کو بہت سے حلقوں میں استناد حاصل تھا۔

بہرحال ایک خاص نوعیت کے تاریخی پس منظر اور متذکرہ بالا کتابوں کے اثرات کے نتیجے میں بھارت میں ایک اقبال مخالف فضا پیدا ہو گئی۔ یہ درست ہے کہ اقبال کے خلاف کوئی باقاعدہ مخالفانہ مہم نہیں چلائی گئی، مگر ان کے متعلق کچھ کہنے سننے کے لیے ماحول، بہ ہر حال ناسازگار اور مخالفانہ ہی تھا۔ ''ایک خاموش طریقے سے اقبال کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ جاری رہا[۱۴]''۔ آزادی کے ربع صدی بعد (تقریباً ۱۹۷۲ء تک) اگرچہ بھارت میں اقبالیات کی صورتِ حال اطمینان بخش نہ تھی؛ تاہم اس عرصے میں ہر سال اقبال پر اکا دکا کتاب چھپ جاتی تھی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۳ء تک، مطبوعاتِ اقبالیات کی اوسط، تقریباً فی سال ایک کتاب بنتی ہے۔ ایک ایسے ملک میں، جہاں اکثریت، اقبال کے بارے میں مخالفانہ جذبات رکھتی ہو، یا اس کا رویہ بے اعتنائی کا ہو اور پھر اس ملک میں اردو کی ریڈر شپ بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی ہو، ہر سال ایک نئی کتاب کا شائع ہو جانا بڑا غنیمت ہے۔ بعض کتابوں کے دو دو تین تین ایڈیشنوں کی اشاعت، ان کی مقبولیت کی دلیل ہے ـــ اس دور کی مطبوعات پر نظر ڈالیں، تو اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر لکھنے والوں نے اقبال کا ہمدردانہ مطالعہ کیا ہے اور ان کی تصانیف سے قارئین پر مثبت تاثرات ہی مرتب ہوتے ہیں[۱۵]۔ اس عرصے میں اقبال کا شعری کلیات اور ''بانگ درا'' بھی کئی مرتبہ شائع ہوئے، جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں کہ بھارت کے عوام و خواص میں علامہ اقبال اور ان کی شاعری کے لیے ایک کشش بہرحال موجود رہی۔

اقبالیات کی اس چلی ربع صدی میں بھارتی اخبارات اور رسائل و جرائد میں اقبال پر مضامین بھی شائع ہوتے رہے، مگر ان سب مطبوعات کے اثرات محدود رہے ۔ بحیثیت مجموعی حالات ناسازگار رہے اور مخالفانہ فضا بدستور موجود ، چنانچہ اقبال دوستوں کو گوناگوں مشکلات کا سامنا تھا ۔ جناب جگن ناتھ آزاد بتاتے ہیں کہ شروع میں :

> ''ہم اقبال کا نام نہیں لے سکتے تھے ۔ ایسے میں مجھے اقبال پر کام کرنے کے لیے ان کے ہندوستانی پس منظر کا سہارا لینا پڑا[۱۶]'' ۔

اس مضمون کے شروع میں ذکر آیا تھا کہ وائس چانسلر کشمیر یونی ورسٹی نے جگن ناتھ آزاد کو اقبال پر توسیعی لیکچروں کی دعوت دی ۔ آزاد صاحب بتاتے ہیں کہ جب انھوں نے یہ لیکچر تیار کر لیے اور اپنے محکمے سے (دہلی سے) سری نگر جا کر توسیعی لیکچر دینے کی اجازت مانگی ، تو وہاں سے کورا جواب ملا ۔ اول تو ان کے پرنسپل انفارمیشن ہی نہیں چاہتے تھے کہ آزاد ، اقبال پر لیکچر دیں ۔ مزید یہ کہ متعلقہ وزیر صاحب نے ان کی چھٹی کی درخواست نامنظور کرکے واپس بھیج دی ۔ سائل نے وزیر موصوف سے ملاقات کے لیے وقت مانگا ۔ وہ انھیں مل کر قائل کرنا چاہتے تھے کہ یہ ایک خالص ادبی معاملہ ہے ، مگر شنوائی نہیں ہوئی ۔ وزیر صاحب کا جواب آیا کہ اگر اقبال کے توسیعی لیکچروں کے متعلق بات کرنا ہے ، تو ملاقات ممکن نہیں[۱۷]۔

اب مزید سنیے — جگن ناتھ آزاد نے بعد ازاں ، جی لیکچر دہلی کی بعض علمی و ادبی انجمنوں میں پیش کیے تو یہاں انھیں سجاد ظہیر جیسے ''ترقی پسند'' کا یہ طعنہ سننے کو ملا کہ تم اقبال پر لیکچروں کے ذریعے مسلم فرقہ پرستی کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہو[۱۸] ۔ بھارت کے ایک اور اقبال شناس ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں :

> ''جب میں نے گورکھپور یونیورسٹی میں اقبال پر ڈاکٹریٹ کا کام شروع کیا ، تو مجھے اس کی اجازت نہ ملی ۔ بعد میں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ چونکہ اقبال کو ہندوستان دشمن سمجھا جاتا ہے ، اس لیے ایسے شخص پر کسی ہندوستانی یونیورسٹی میں کام نہیں ہو سکتا[۱۹] ''۔

اس کے اثرات بہت دیر تک باقی رہے ۔ اقبال صدی سے کچھ ہی عرصہ

پہلے جگن لال آزاد کشمیر یونی ورسٹی کے لیے اقبال نمایش مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے اقبال کی بعض تصویروں اور تحریروں کی تلاش کے سلسلے میں اخبارات میں مراسلے شائع کرائے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اگرچہ بعض حلقوں کی طرف سے تعاون ملا، مگر کچھ کرم فرماؤں کے عتاب نامے بھی موصول ہوئے، جن میں اس قسم کی عبارت درج تھی کہ آپ ہندستان کے ایک دشمن کی یاد میں نمایش کا انتظام کر رہے ہیں۔ اگر اس وقت ہندستان میں مسلم نواز [جنتا] حکومت نہ ہوتی اور کوئی صحیح طرح کی جمہوری حکومت ہوتی، تو آپ اس وقت جیل خانے میں ہوتے۔ ایک صاحب نے تو یہ لکھا کہ آپ کا نام ملک کے غداروں کی فہرست میں لکھا جائے گا[۲۰]۔

اس عرصے میں بھارت اور پاکستان کے درمیان دو بار جنگ ہوئی (۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء)۔ بھارت میں پاکستان مخالف جذبات میں اضافہ ہوا، بلکہ دونوں ملکوں میں ایک ایسی کشیدہ فضا پیدا ہو گئی، جس نے باہمی تعلقات کو ہر سطح پر متاثر کیا۔ اقبالیات کی صورتِ حال بہتر ہونے میں ابھی بھی کشیدگی، رکاوٹ بنی رہی۔

بہ ہرحال بھارت میں اقبالیات کا پہلا دور ۱۹۷۳ء پر ختم ہوتا ہے۔

(۲)

بے اعتنائی اور مغائرت کے بادل چھٹنے اور اقبالیات کے چہرے پر جمی برف پگھلنے میں ایک ربع صدی بیت گئی۔ ۱۹۷۳ء سے بھارت میں اقبالیات کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، جسے میں اقبال شناسی اور اقبال فہمی کا دور کہوں گا۔

۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء میں آل انڈیا ریڈیو سے علامہ اقبال کی غزلیں نشر ہونا شروع ہوئیں[۲۱]۔ اس عرصے میں، اقبال پر شائع ہونے والے مضامین اور کتابوں نے بھی قارئین کے ذہنوں پر بہرحال کچھ نہ کچھ اثر ضرور مرتب کیا ہوگا۔ یوں بھی ربع صدی میں پُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ اس لیے وقت کے ساتھ، بھارت میں ذکرِ اقبال کے لیے نرم گوشا پیدا ہوتا گیا۔ ۱۹۷۳ء کے زمانے میں اقبالیات کے منجمد سمندر میں تموج کی پہلی لہر نمودار ہوئی۔

اس وقت تک ۱۸۷۷ء ہی کو علامہ اقبال کا سالِ ولادت تسلیم کیا جاتا تھا ۔ اس مناسبت سے ۱۹۷۳ء میں اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کا غلغلہ بلند ہوا ۔ بھارتی اخبارات میں سالِ ولادت کی بحث چھڑی ، تو اس سے اقبالیات کا فراموش شدہ موضوع تازہ ہو گیا ۔ بہت سی علمی اور ادبی انجمنیں اقبال صدی تقریبات کے پروگرام ترتیب دینے لگیں ۔ حکومت کے رویے میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی ۔

اس موقع پر بھارت کے مختلف شہروں میں اقبال سیمینار منعقد ہوئے ۔ پروفیسر آل احمد سرور نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ مذاکرے (۲۳ تا ۲۵ مارچ) کا اہتمام کیا ۔ دوسری اہم تقریب اقبال اکیڈیمی حیدر آباد دکن کا چار روزہ سیمینار تھا (۱۱ تا ۱۴ مئی) بھارت کے مختلف شہروں میں ایسی بہت سی مجالس اور مذاکرے منعقد ہوئے ، جن میں عالمانہ مقالے پڑھے گئے اور ان پر بصیرت افروز گفتگو ہوئی ۔ اس طرح کی تقریبات سے اقبالیات کے لیے راہ ہموار ہونے لگی ۔ بھارت کے بہت سے نقادوں نے تو اپنی تصنیفی زندگی میں پہلی بار اقبالیات سے اعتنا کیا ۔ اقبال کے بارے میں بھارتی دانش وروں ، عالموں اور ادیبوں کے تاملات (Reservations) میں بڑی حد تک کمی واقع ہوئی اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئیں ۔ اب اقبال ایک ایسے علمی و ادبی موضوع کی حیثیت اختیار کر گیا ، جس پر اہلِ قلم کچھ نہ کچھ کہنے سننے اور لکھنے کی گنجایش اور ضرورت محسوس کرنے لگے ۔ علی گڑھ سیمینار میں ، علی سردار جعفری کی تحریک پر ایک قرارداد منظور کی گئی ، جس میں کہا گیا کہ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی تقاریب منائی جائیں ۔

عوامی سطح پر اقبال کے تعارف اور مقبولیت میں اقبال نمایش نے نمایاں کردار ادا کیا ۔ کشمیر یونی ورسٹی کی تجویز پر اور حکومتِ ہند کے تعاون سے جناب جگن ناتھ آزاد کی تیار کردہ تصویری نمایش پہلی بار ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو سری نگر میں منعقد ہوئی ۔ بعد ازاں یہ بھارت کے تمام بڑے بڑے شہروں (دہلی ، لکھنؤ ، بمبئی ، پٹنہ ، حیدر آباد ، علی گڑھ ، مدراس ، وتیم باڑی ، اجمیر ، چنڈی گڑھ اور پونا وغیرہ) میں دکھائی گئی ۔ دہلی میں شایقین کے اصرار پر تین بار اور علی گڑھ میں دو بار اس کا اہتمام کیا گیا ۔ ڈی اے وی پی کے ریکارڈ کے مطابق بھارت کے تین لاکھ افراد نے یہ نمایش دیکھی[۲۲] ۔ گویا اب علمی و ادبی حلقے عوام الناس اور سرکار — تینوں اقبال کی جانب اعتنا کرنے لگے ۔ اس مشترکہ

دلچسپی کے نتیجے میں بھارت میں اقبال کے متعلق تعصبات کی فضا تبدیل ہونا شروع ہوئی اور غلط فہمیاں دور ہونے لگیں :

> ''سرکار کی نظر بدلی تو غبار بھی ہلکا ہوا ۔ مطالعۂ اقبال کی راہیں ہموار ہوئیں — اقبال قومی پروگراموں میں شامل ہوئے ۔ ملک کے خاص و عام میں ان کا نام مقبول ہوا ۔ ان تقریبات کی بدولت اقبال پر مضامین و مقالات ، تصنیف و تالیف کا ایک ذخیرہ سامنے آیا[۲۳]''۔

گو ، اس زمانے میں بھی اقبال مخالفین نے یہ کہا کہ اقبال نمایش کے بعد، اب جناح نمایش منعقد ہوگی[۲۴]۔ تاہم اہل ہند نے محسوس کر لیا تھا کہ بین الاقوامی سطح پر ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے اقبال کو جو شہرت اور اہمیت مل رہی ہے ، اس کے پیش نظر ، اقبال سے بے اعتنائی بہت بڑی کوتاہی ہوگی ۔ اقبال بھارت کی علمی ، تہذیبی اور سیاسی ضرورت بن چکا تھا ۔ گویا بھارت نے اقبال کے باب میں اپنی غلطی کا احساس کر لیا تھا ۔ جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں :

> ''تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے [بھارت] ایک بڑا ملک ہے ۔ یہاں فرقہ وارانہ فسادات کے باوجود اُن عناصر کی بھی کمی نہیں ، جنھیں صحت مند عناصر کہا جا سکتا ہے ۔ اس بڑے ملک نے علامہ اقبال کے متعلق خاموشی اختیار کر کے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی اور ملک کو جب اس غلطی کا احساس ہوا تو اس غلطی یا کوتاہی کی تلافی بھی ایک بڑے ملک کے شایانِ شان طریقے سے کی ۔ یعنی جب اقبال کی یاد منانے کا خیال اس ملک کو آیا ، تو گویا اس موضوع پر جلسوں اور سیمناروں کا ایک سیلاب آ گیا[۲۵]''۔

ادھر پاکستان میں اقبال کی تاریخِ ولادت پر بحث جاری تھی ۔ حکومتِ پاکستان کی مقررہ کردہ کمیٹی کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے کے لیے ضروری معلومات اور شہادتیں جمع کرنے میں مصروف تھی ۔ بعض پاکستانی محققوں کے مطابق ۲۹ دسمبر ۱۸۷۷ء صحیح تاریخ پیدایش تھی ۔ چنانچہ بعض حلقوں نے اس کے مطابق صد سالہ تقریبات کا اہتمام کیا ۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے اہتمام میں مجلسِ ترقی ادب اور بزم اقبال نے بعض قابلِ قدر مطبوعات اور ''صحیفہ'' کا ایک ضخیم اور یادگار اقبال نمبر شائع کیا ۔ (مرتبہ : ڈاکٹر وحید قریشی) ۲۹ دسمبر کی شام ایک تقریب منعقد ہوئی ، جس کے اختتام پر اقبال پر نادر

کتابوں کی ایک نمایش دکھائی گئی — پاکستان میں اس نوع کی تقریبات بھی بھارت کے اقبال دوستوں کے لیے مہمیز ثابت ہوئیں۔ صدی تقریبات کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں علی گڑھ کے سیمے نار میں ایک قرارداد کے ذریعے ۱۹۷۷ء میں صدی تقریبات منانے کا عزم ظاہر کیا گیا تھا، مگر اقبال دوستوں کو طویل انتظار کا یارا نہ تھا۔ انھوں نے "کل ہند اقبال صدی تقریبات کمیٹی" قائم کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ اسے بھارت سرکار کی اشیرباد حاصل تھی۔ مرکزی وزیر منصوبہ بندی جناب ڈی پی دھر اس کے صدر اور جناب علی سردار جعفری سیکریٹری مقرر ہوئے۔ کمیٹی اور اس کی سات ذیلی مجالس میں بھارت کے بہت سے دانش ور، ادیب، شاعر، نقاد اور عالم شامل تھے۔ اس کل ہند کمیٹی کے تعاون سے ملک کے مختلف شہروں میں علاقائی اور مقامی اقبال مجالس قائم ہوئیں، جن کے زیر اہتمام، مذاکروں اور لیکچروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یونی ورسٹیاں اور دوسرے علمی ادارے بھی اقبال مجالس کا انعقاد کرنے لگے۔ مرکزی کمیٹی نے پہلا سیمے نار، حیدرآباد دکن میں منعقد کیا (نومبر ۱۹۷۴ء) اس سیمے نار کو "فکر اقبال" کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ سری نگر سیمے نار کا افتتاح شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھوں ہوا۔ دہلی میں دو اہم سیمے نار منعقد ہوئے۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی اور دہلی یونی ورسٹی کے مشترکہ اہتمام سے صدی سیمے نار (۲۱ تا ۲۳ اپریل ۱۹۷۷ء) منعقد ہوا۔

۱۹۷۳ء کے بعد سے، اقبالیات کے لیے جو سازگار فضا پیدا ہوئی، اس کے نتیجے میں اس زمانے میں اقبال پر مطبوعات کی صورت حال بھی بہتر ہوتی گئی۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک کے تین برسوں میں ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہوئیں۔ یہ تناسب چلی ربع صدی (۱۹۴۸ء تا ۱۹۷۲ء) کے مقابلے میں کہیں زیادہ حوصلہ افزا تھا۔ بعض پاکستانی کتابیں بھی بھارت میں چھپنے لگیں۔

اس زمانے کا ایک اہم واقعہ کشمیر یونی ورسٹی میں "اقبال چیر" کا قیام ہے۔ یہ دنیا کے کسی بھی علمی ادارے یا یونی ورسٹی میں پہلی "اقبال چیر" تھی۔ اس کی تحریک جناب جگن ناتھ آزاد نے کی تھی۔ انھوں نے (اس وقت کے وزیر اعلیٰ) شیخ عبداللہ سے مل کر انھیں اقبال چیر کی اہمیت و افادیت کا احساس دلایا۔ اقبال چیر کے قیام کے سلسلے میں، اعتراف کرنا چاہیے کہ کشمیر کو پاکستان پر تقدم و تفوق حاصل ہے۔ میں نے اسے ایک اہم واقعہ قرار دیا ہے، کیونکہ بعد ازاں، یہ چیر ایک مکمل اور مستقل ادارے 'اقبال انسٹی ٹیوٹ'

میں تبدیل ہوگئی اور اس نے اقبال شناسی کے فروغ و استحکام میں ایک تاریخی کردار ادا کیا۔ السٹی ٹیوٹ کے کردار پر، آیندہ صفحات میں مزید کچھ عرض کیا جائے گا۔

راقم الحروف نے، مابعد ۱۹۷۲ء کے زمانے کو اسی لیے اقبال فہمی اور اقبال شناسی کا دور کہا ہے کہ اس زمانے میں اہلِ بھارت نے تفہیم و تحسینِ اقبال کے ضمن میں بہتر شعور کا مظاہرہ کیا۔ پہلے اقبال اجنبی تھا، اب اسے ایک طرح سے اپنا (own کر) لیا گیا۔ کل ہند اقبال صدی تقریبات کمیٹی کے پہلے سیمے نار (منعقدہ حیدرآباد) میں کمیٹی کے صدر جناب ڈی پی دھر نے، جو افتتاحی خطبہ پڑھا، یہاں اس کا ایک اقتباس بے محل نہ ہوگا۔ انھوں نے کہا:

"میں بھی آپ کی طرح اقبال کے شعر و فکر کا گرویدہ ہوں اور اقبال کا گرویدہ ہونا خوش مذاقی کی دلیل ہے۔

"اقبال ہندستان میں پیدا ہوئے اور ہندستان ہی میں ان کی وفات ہوئی، لیکن ہم انھیں صرف ہندستان کا شاعر بنا کر نہیں رکھنا چاہتے، کیونکہ ان کی نظر میں سارا عالمِ انسانیت تھا:

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

"ہم اپنی اس دولتِ بیدار کو چاند اور سورج کی روشنی کی طرح ساری دنیا میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں — میں ہندستان، پاکستان اور سارے عالمِ انسانیت کو دعوت دے رہا ہوں کہ اقبال کے صد سالہ جشن میں شریک ہوں[۲۶]"۔

"ہم"، "میں" اور "اپنی اس دولتِ بیدار" پر غور فرمائیے — بلاشبہ اقبال، محض بھارت، یا صرف پاکستان یا مسلمانوں کی میراث نہیں، وہ پوری انسانیت کا سرمایہ ہیں اور ان کی شاعری ایک ایسی متاع ہے، جس سے استفادہ و فیض یابی کے لیے کسی ملک یا قوم کو متامل نہیں ہونا چاہیے۔ ہم اقبالیوں کے لیے باعثِ مسرت و اطمینان ہے کہ اہلِ بھارت کے ذہنی تحفظات اقبال کو اپنانے میں رکاوٹ نہیں بنے۔

(۳)

اقبال صدی (۱۹۷۷ء) تک آتے آتے ، اقبال کے بارے میں عوام و خواص کا جوش و خروش نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ۔ بھارت کے صدر جناب فخرالدین علی احمد کل ہند اقبال صدی تقریبات کمیٹی کے سرپرست تھے ۔ صدی تقریبات والہانہ ذوق و شوق سے منائی گئیں ۔ اس سلسلے کی سب سے بڑی تقریب دہلی کا چار روزہ بین الاقوامی سیمینار تھا (۳۰ اکتوبر تا ۲ نومبر ۱۹۷۷ء) جس میں پاکستان کے چار رکنی وفد کے علاوہ ایران ، عراق ، برطانیہ ، مغربی جرمنی ، چیکو سلواکیہ اور مصر کے وفود بھی شامل ہوئے ۔ میزبان ملک سے ۳۶ مندوبین شریک تھے ۔ غالباً پاکستان کی ہفت روزہ عالمی اقبال کانگریس (لاہور، ۲ تا ۸ نومبر) سے پہلے ، یہ سب سے بڑا عالمی اجتماع تھا ۔ سیمینار سے ایک روز پہلے ۲۹ نومبر کی شب وگیان بھون میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا ۔ ۳۰ کو پروفیسر اوما شنکر جوشی نے سیمینار کا افتتاح کیا ۔ وزیر اطلاعات جناب کے ایل الوانی کے ہاتھوں ، جگن ناتھ آزاد کے تیار کردہ تصویری البم "مرقع اقبال" کا اجرا عمل میں آیا ۔ سیمینار کے آٹھ جلسوں میں ۳۶ مقالات پڑھے گئے ۔ جشن اقبال کی مناسبت سے دہلی میں انھی دنوں ایک تصویری نمائش بھی منعقد ہوئی ۔ علاوہ ازیں ایس ایم مہدی کا تحریر کردہ ایک ڈراما "اقبال" کھیلا گیا ، امینہ دہلوی کی اقبال معموری کی نمایش ہوئی اور مندوبین کے اعزاز میں بعض اداروں نے استقبالیے دیے ۔ سیکریٹری نے افتتاحی تقریر میں پاکستانی وفد کا بطور خاص ذکر کرتے ہوئے کہا : ہمارے پاکستانی دوست کئی سالوں بعد بھارت آ کر کسی ثقافتی اجتماع میں شریک ہو رہے ہیں ، ان کی آمد پر ہمارے دل جذبات مسرت سے معمور ہیں ۔ ہم آپ کو سیمینار ہی میں خوش آمدید نہیں کہہ رہے ، پورا بھارت آپ کو خوش آمدید کہتا ہے ۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ مہمان بن کر بار بار ہمارے ملک میں تشریف لائیں[۲۷]۔ (خیال رہے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد پاکستان سے بھارت جانے والا یہ پہلا ثقافتی وفد تھا) ۔ جناب علی سردار جعفری نے اس تعاون و اشتراک کو "اقبال کے نام کی برکت[۲۸]" سے منسوب کیا ۔

اس موقع پر بھارت سرکار کے فلمز ڈویژن نے اقبال کی زندگی اور فکر و فن پر ایک رنگین دستاویزی فلم بنانے کا فیصلہ کیا — یہ فلم جناب علی سردار

جعفری اور خواجہ احمد عباس نے تیار کی اور اپریل ۱۹۷۸ء میں جاری ہوئی - اس کی فلم بندی دہلی ، بمبئی اور کشمیر کے علاوہ لاہور اور سیالکوٹ میں کی گئی تھی -

۱۹۷۷ء میں جشنِ اقبال کی جو تقریبات شروع ہوئیں ، ان کا سلسلہ بعد میں بھی خاصے عرصے تک چلتا رہا - متعدد اہم سیمینار منعقد ہوئے ، کتابیں اور رسالوں کے خاص نمبر چھپے - دور دراز واقع بعض چھوٹے شہروں میں بھی اقبال تقریبات اور سیمینار منعقد ہوئے - اقبال موضوعات پر مضمون نگاری ، تقاریر اور بیت بازی کے انعامی مقابلے ہوئے - اقبال کا مطالعہ بعض نصابات میں شامل ہوا (اس وقت بھارت کی تقریباً ساٹھ جامعات میں ایم اے اور ایم فل کی سطح پر اقبالیات کی تدریس ہو رہی ہے[۲۹]) - جامعاتی سطح پر ، اگرچہ بہت پہلے سے اقبالیاتی تحقیق ہو رہی تھی[۳۰] - مگر ۱۹۷۳ء کے بعد سے یہ موضوع نسبتاً اہمیت اختیار کر گیا ہے اور مختلف جامعات میں اقبالیاتی موضوعات پر ایم اے ، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے بیسیوں مقالات تحریر کیے گئے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے[۳۱] -

۱۹۷۷ء کے بعد مزید دو بین الاقوامی سیمینار منعقد ہو چکے ہیں (۱) اہتمام : اقبال اکیڈیمی حیدرآباد دکن ، ۱۸ تا ۲۱ اپریل ۱۹۸۶ء[۳۲] - ۲) اہتمام : شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ۱۵ تا ۱۸ فروری ۱۹۸۷ء)[۳۳] - اقبالیات کی اشاعتی رفتار تیز ہو گئی ہے اور مطبوعات کا گراف بلند ہو رہا ہے - اقبال کے اردو کلام کا کلیات اور علاحدہ مجموعے بھی دہلی ، لکھنؤ اور حیدرآباد سے بار بار شائع ہوئے ہیں - پاکستان کی تقریباً ساری ہی اہم تنقیدی اور تشریحی کتابیں بھارت کے ناشرین نے شائع کر لی ہیں - اگرچہ بیشتر صورتوں میں یہ مصنفین کی اجازت کے بغیر چھپی ہیں، مگر پاکستان کے اقبالیاتی ادب کی ، بھارت میں اشاعت بجائے خود اہم بات ہے - ''شاعر'' بمبئی نے اپنے ضخیم اقبال نمبر (۱۹۸۸ء) میں متعدد پاکستانی کتابیں، یا ان کے اہم حصے شامل کر لیے ہیں -

(۴)

بھارت میں اقبال شناسی ۱۹۷۳ء ، خصوصاً ۱۹۷۸ء کے بعد دائرہ در دائرہ وسعت پذیر ہوتی رہی ہے - اس میں سرکاری پالیسی کے ساتھ ، بعض اقبالی اداروں اور انجمنوں کا بھی گہرا دخل ہے — اس عرصے میں ہوں تو کئی ادارے

قائم ہوئے ۔ مثلاً : اقبال میموریل ٹرسٹ مالیر کوٹلہ ، اقبال اکیڈیمی محبوب نگر (دکن) ، اقبال ادبی مرکز بھوپال ، اقبال اکادیمی بھوپال وغیرہ ، لیکن فروغِ اقبالیات میں دو اداروں نے سب سے فعال کردار ادا کیا ہے ۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کا آغاز ۱۹۷۷ء میں کشمیر یونی ورسٹی میں ''اقبال چیر'' کے قیام سے ہوا اور جناب آل احمد سرور اقبال پروفیسر مقرر کیے گئے۔ ۱۹۷۹ء میں اسے انسٹی ٹیوٹ کا درجہ دیا گیا تو عملے میں بھی کچھ اضافہ ہوا ۔ ڈاکٹر کبیر احمد جائسی ریڈر اور محمد امین اندرابی لیکچر مقرر ہوئے اور پروفیسر آل احمد سرور کی سربراہی میں اس نے اقبالیات کے مختلف سمتوں میں تیزی سے کام شروع کر دیا۔ انسٹی ٹیوٹ نے چند اہم موضوعات پر نہایت معیاری سیمینار منعقد کیے ہیں، جیسے : اقبال اور تصوف، اقبال اور مغرب ، تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال، جدیدیت اور اقبال، اقبال کی شاعری اور شعریات، اقبال اور اردو نظم وغیرہ ۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ، پروفیسر وحید الدین ، ڈاکٹر عالم خوند میری اور پروفیسر مسعود حسین خاں جیسے اصحاب نے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اور بعض نے توسیعی لیکچروں کے ذریعے اپنے علم و فضل سے اقبالیات کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ انسٹی ٹیوٹ نے جملہ عالمانہ لیکچروں اور سیمیناروں کے مقالوں کو کتابی صورت میں شائع کیا ۔ یہ مجموعے مقالات و مباحث کے معیار کے لحاظ سے ، بھارت کے اقبالیاتی ادب میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔ انسٹی ٹیوٹ کا مجلہ ''اقبالیات'' تین شماروں کے بعد ، اب تعطل کا شکار ہے ۔ یہاں سے ۱۹۸۱ء میں چار اور ۱۹۸۲ء میں تین امیدواروں نے ایم فل کیا ۔ ۱۹۸۲ء کی ایک اطلاع کے مطابق انسٹی ٹیوٹ میں تین امیدوار ایم فل اور چار امیدوار پی ایچ ڈی کے لیے اقبالیات کے مختلف موضوعات پر تحقیق میں مصروف تھے ۔ نئی نسل میں اقبال کا نورِ بصیرت عام کرنے کے لیے مضمون نویسی اور بیت بازی کے انعامی مقابلے بھی شروع کیے گئے ۔ بلاشبہ اقبال شناسی کے فروغ کے لیے انسٹی ٹیوٹ کی ہمہ جہتی کاوشیں اہم اور قابل ستایش ہیں ۔

کشمیر سے اقبال کے مخصوص تعلق کی بنا پر اہلِ کشمیر اقبالیات میں ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے ہیں ۔ شیخ محمد عبداللہ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ :

''اقبال کو بھر سے جائز مقام دلوانے کے لیے پہلی کوشش کشمیر ہی سے شروع ہوئی ، خواہ وہ علامہ اقبال کے متعلق توسیعی

لیکچروں کی صورت میں ہوئی ہو یا اقبال نمایش کی صورت میں اور پھر کشمیر یونی ورسٹی میں اقبال چیر کے قیام کے سلسلے میں ابھی کشمیر اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اسے اس ضمن میں بھی اولیت کا شرف حاصل ہے"۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کا قیام اور اس کا فعال کردار ، اقبالیات میں اہلِ کشمیر کی بھرپور دلچسپی کا عملی ثبوت ہے ۔ اِدھر کچھ عرصے سے ، شاید پروفیسر آل احمد سرور کی سبک دوشی کے سبب ، انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیاں کچھ ماند سی پڑ گئی ہیں ۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ سے باہر، جموں و کشمیر میں، بعض اصحاب اپنی آزادانہ حیثیت میں اقبالیات کے ضمن میں سرگرم عمل رہے ہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں نام پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا ہے ۔ انھوں نے اقبال پر اپنا بیشتر تحقیقی و تنقیدی کام سری نگر اور جموں میں رہ کر کیا ہے ۔ فی الحقیقت بھارت میں اقبالیات کا علم بلند کرنے اور اقبال شناسی کے فروغ میں ان کا رول بہت بنیادی حیثیت رکھتا ہے ۔ (اس ضمن میں ان کی کاوشیں ایک مستقل اور مفصل مطالعے کا تقاضا کرتی ہیں) ۔

کشمیر یونی ورسٹی کا ایک شعبہ ہونے کی وجہ سے ، اقبال انسٹی ٹیوٹ کو سرکاری سرپرستی اور مالی اعانت و تائید میسر رہی ۔ اس کے برعکس حیدرآباد دکن کی اقبال اکیڈیمی کسی طرح کی سرکاری اعانت کے بغیر، چند اقبال دوستوں کے نجی وسائل سے قائم ہوئی تھی (۱۹۵۹ء) ۔ علامہ اقبال سے جناب خلیل اللہ حسینی کی پر خلوص محبت اور ایک انتہائی دلی تعلق ہی اس کا اصل سرمایہ تھا ۔ حسینی صاحب نے حد درجہ نامساعد حالات میں بھی اپنی سی جد و جہد جاری رکھی اور اقبال کے نوجوان مخلصین اور مداحین کا ایک ایسا حلقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ، جس نے فکرِ اقبال کی روشنی پھیلانے میں نہایت پرجوش اور بھرپور طریقے سے کام کیا ۔ یہ اس اعتبار سے ایک منفرد ادارہ ہے کہ اس کے تمام رفقاء اعزازی طور پر خدمات انجام دیتے ہیں ۔ اکیڈیمی نے ملکی سطح پر متعدد اقبال سیمے نار منعقد کرائے ۔ ۱۹۸۵ء میں چار روزہ بین الاقوامی سیمے نار ، غالباً اکیڈیمی کی تاریخ کا سب سے بڑا اجتاع تھا ۔ اس موقع پر ایک شاندار اقبال نمایش ہوئی اور ایک مشاعرہ بھی — راقم الحروف اس عالمی اجتاع میں شریک تھا ۔ محسوس ہوا کہ حیدر آبادی عوام میں اقبال

اور ان کے فکر اور شاعری کے لیے ایک غیر معمولی اور والہانہ جذبہ پایا جاتا ہے ۔ علامہ اقبال کے انگریزی خطبات ، ریاست حیدر آباد سے اقبال کی دلچسپی اور بعض دکنی اکابر سے ان کے تعلقِ خاطر کے پس منظر میں ، جنوبی ہند میں اقبال وابستگی کی ایک عام فضا پیدا کرنے میں اقبال اکیڈیمی کی کاوشوں کو خاصا دخل ہے ۔ دکن کے متعدد دانشوروں نے اقبال شناسی میں نام آوری حاصل کی ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، پروفیسر غلام دستگیر رشید، خلیفہ عبدالحکیم ، ڈاکٹر عالم خوند میری ، ڈاکٹر غلام عمر خاں ـــــ اقبال اکیڈیمی نے ان بزرگوں کی تحریروں سے اقبالیات کا عرفان پھیلانے میں مدد لی ہے ۔ اس نے مختلف اوقات میں درسِ اقبال ، تقریری و تحریری مقابلوں اور اقبال کونز کا اہتمام کیا ۔ ۱۹۸۵ء سے اقبال ایوارڈ کا سلسلہ جاری ہے ۔ اب تک یہ ایوارڈ پروفیسر غلام دستگیر رشید ، ڈاکٹر عالم خوند میری اور سید مظفر حسین برنی کو دیا جا چکا ہے ۔ دکن کے دیگر شہروں میں بھی اقبال اکیڈیمیاں قائم ہیں اور حیدرآباد کی اکیڈیمی سے منسلک ہیں ۔

کچھ عرصہ پہلے کلکتہ یونی ورسٹی میں اقبال چیر قائم ہوئی تھی ۔ اس کے لیے فیض احمد فیض کو نامزد کیا گیا تھا، مگر وہ یہ ذمہ داری نہیں سنبھال سکے ۔ چیر کئی سال تک خالی رہی ۔ حال ہی میں پروفیسر مظفر حنفی کو اس چیر کا پروفیسر مقرر کیا گیا اور خبر آئی ہے کہ انھوں نے اپنی ذمہ داری سنبھال لی ہے ۔

اقبال ادبی مرکز بھوپال کی کوئی نمایاں کارگزاری تا حال سامنے نہیں آ سکی ۔ بھوپال شہر کو اقبال سے ایک دیرینہ نسبت ہے اور اب سرکاری سرپرستی میں قائم شدہ ''اقبال میدان'' اور مجسمۂ شاہین اسی نسبت کی یاد دلاتا ہے ۔ مدھیہ پردیش سرکار نے اقبال کے نام پر ایک لاکھ روپے کا سالانہ ایوارڈ بھی جاری کر رکھا ہے ۔ یہ کسی بھی شخص کو اس کی نمایاں ادبی خدمات پر عطا کیا جاتا ہے ۔ اب تک علی سردار جعفری اور قرۃ العین حیدر اقبال ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں ۔ بھوپال میں سب سے معمر اقبالی شخصیت جناب ممنون حسن خاں کی ہے ۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور ڈاکٹر اخلاق اثر نے اقبالیات کے باب میں قابلِ قدر کام کیے ہیں ۔ بھوپال ہی کے ماسٹر اختر نے ممنون حسن خاں کے بعض بیانات کو مشکوک ٹھہرایا ، مزید برآں انھوں نے لمعہ حیدر آبادی کے نام خطوطِ اقبال کی اصابت کو چیلنج کر کے ، اقبالیاتی

تحقیق و مباحثے کا ایک نیا در وا کر دیا ہے[۳۵] ۔

(۵)

۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی شب ، جب بھارت کی قانون ساز اسمبلی میں بھارت کا ترنگا جھنڈا پیش کیا گیا ، تو شریمتی سوچیتا کرپلانی نے اقبال کا ترانۂ ہندی گایا :

ع سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا[۳۶]

اقبال سے اہلِ ہند کی دلچسپی اور محبت کا سب سے بڑا حوالہ ''ترانۂ ہندی'' ہے ۔ اقبال کی یاد میں جاری کیے گئے ، بھارت کے ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ پر اقبال کی شبیہ کے ساتھ ''ترانۂ ہندی'' کا یہی پہلا شعر درج ہے ۔ بھارتی اہلِ قلم کے لیے اقبال کی شاعری کے ''ہندستانی عناصر'' ہی سب سے زیادہ باعثِ کشش رہے ہیں ۔ ان کے نزدیک اقبال ہندستان کے ایک مثالی فرزند تھے ، جو ہندستان میں پیدا ہوئے اور جس انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا ۔ انھیں اپنے ہندستانی ہونے پر فخر تھا ۔ وہ ہندو سنتوں ، بھگتوں اور فلسفیوں کا احترام کرتے تھے اور انھوں نے قدیم ہندستانی فلسفے اور روایات سے بہت کچھ اخذ و اکتساب کیا ہے ۔ اقبال پر لکھنے والے کم ہی ایسے مصنف ہوں گے ، جنھوں نے اقبال کی دور اول کی وطنی شاعری ، ''ضربِ کلیم'' کی نظم ''شعاعِ امید'' اور ''جاوید نامہ'' میں مذکور روحِ ہند کے حوالے سے شعرِ اقبال کے ''ہندستانی عناصر'' اور اقبال کی سچی اور کھری حب الوطنی کا ذکر نہ کیا ہو ۔ ایک محبِ وطن کے طور پر اقبال کا تذکرہ ، بھارت میں اقبال شناسی کا سب سے اہم اور قوی رجحان ہے ۔

سرزمینِ ہند سے اقبال کی وابستگی اور لگاؤ کسی شک و شبہے سے بالاتر ہے ۔ بالیقین وہ بہت بڑے محبِ وطن تھے ۔ ان کی ہشت پہلو شاعری اور فکر کا ایک رخ (حب الوطنی) اہل بھارت کو اپیل کرتا ہے ، تو یہ ہرگز قابلِ اعتراض نہیں — عالمی اقبال میلے نار (اپریل ۱۹۸۶ء) حیدر آباد دکن کے افتتاحی اجلاس میں آندھرا پردیش کے ، اس وقت کے ، وزیر اعلیٰ این ٹی راما راؤ نے '' ترانۂ ہندی'' ، ''ہندستانی بچوں کا قومی گیت '' اور ''لبا شوالہ'' کے بعض اشعار ، اپنے مخصوص لہجے میں لہک لہک کر پڑھے تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا ۔ اقبال کے لیے اہلِ بھارت کی والہانہ اپنائیت ، بڑی حد تک ان کی شاعری کے اسی زاویے (حب الوطنی) کی مرہونِ منت ہے ،

لیکن اگر اصرار کیا جائے کہ بس "متاعِ فقیر" یہی کچھ ہے اور پھر حب الوطنی سے آگے بڑھ کر ، اقبال کو وطن پرست قرار دیا جائے اور اسی حوالے سے مسلم تشخص پر مبنی ، اقبال کے نظریۂ قومیت سے انکار کرتے ہوئے کہا جائے کہ انھوں نے شمال مغربی ہند میں کسی آزاد مسلم ریاست یا پاکستان کا کوئی تصور نہیں پیش کیا ، تو یہ یقیناً "ترانۂ ہندی" لکھنے والے اقبال کے ساتھ بے انصافی اور زیادتی ہوگی ۔ تھامپسن کے نام خطوں کے حوالے سے بہت گرد اڑائی گئی ہے[۳۷] ۔ سید مظفر حسین برنی نے بجا لکھا ہے کہ :

"اقبال کے نظریۂ وطنیت و قومیت میں خاصا خلطِ مبحث ہو گیا ہے اور ان مختلف تعبیریں کرنے والوں نے اپنے ذہنی ابہام اور فکری انتشار کو اقبال سے منسوب کر دیا ہے[۳۸]"۔

بھارت میں آپ کو اقبال شناسی کی بہت سی ایسی مثالیں مل جائیں گی[۳۹]، مگر اطمینان کا باعث یہ ہے کہ متعدد نامور اقبال شناسوں (پروفیسر آل احمد سرور ، اسلوب احمد انصاری ، جگن ناتھ آزاد ، علی سردار جعفری[۴۰]) نے کشادہ ظرفی کے ساتھ ، اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اقبال نے جس مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تھا ، بعدازاں پاکستان کے نام سے اس کی صورت گری ہوئی ۔

علامہ اقبال ایک شاعر تھے ، مفکر و فلسفی بھی اور ایک مصلح و پیغامبر بھی — مگر اولیت و فوقیت کسے حاصل ہے ؟

اہلِ بھارت کے پاس اس کا واضح جواب یہ ہے کہ وہ شاعر پہلے تھے ، مفکر بعد میں — "اقبال ، بہ طور شاعر" اقبالیاتِ بھارت کا ایک اور نمایاں رجحان ہے ۔ ڈاکٹر گوپال ریڈی جیسے لوگ صرف شاعر اقبال کے مداح ہیں ۔ وہ علانیہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اقبال نے پاکستان کا تصور دیا یا نہیں ؟ یا وہ اسلام کے متعلق کیا کہتے ہیں وغیرہ ۔ گویا اقبال کے خیالات و افکار سے بے نیاز و لاتعلق رہنے والے ایسے مداحینِ اقبال ، محض ان کے فن میں کھوئے رہنا چاہتے ہیں ۔

اقبال کی شاعرانہ حیثیت پر زور دینے والوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے ، جسے اقبال کا " شیوۂ پیغمبری" کھٹکتا ہے ۔ وہ اقبال کے "پیغام" سے کمی قدر الرجک ہیں — ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کے خیال میں "پیغام پر زور دینے

کے بجائے شعرِ اقبال پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ شعرِ اقبال خاصی عظیم خصوصیات کا حامل ہے اور اس کو ابھارنے کی ضرورت ہے اور اس"[۳۱]۔ چنانچہ ڈاکٹر رفتوکی کے ہاں، شاعر اقبال کی تحسین و تائید، ایک مجبوری محسوس ہوتی ہے، (تاکہ پیامبر اقبال پس منظر میں رہے)۔ اصل میں اقبال شناسی کا یہ زاویہ بھی مجنوں گورکھ پوری کا مرہونِ منت ہے۔ اقبال کی پیامبری اور "مجازیت" انھیں ہمیشہ کھٹکتی رہی، ان کے نزدیک "اقبال کی پہلی اور آخری حیثیت شاعر کی ہے"۔ اور ان کی یہی حیثیت سب سے زیادہ "مستقل اور ممتاز" ہے[۳۲]۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بحیثیت مجموعی تنقیدِ اقبال کا غالب حصہ، مفکر اور فلسفی اقبال سے بحث کرتا ہے۔ شاعر اقبال سے خاطر خواہ اعتنا نہیں ہوا اور یہ اقبالیات کا ایک کمزور پہلو ہے۔ اسی لیے بھارت میں، جہاں مفکر اقبال کے مقابلے میں شاعر اقبال، بہ وجوہ کہیں زیادہ قابل قبول حیثیت رکھتا ہے، عام طور پر یہ شکوہ کیا گیا ہے کہ: "مصلح اقبال اور فلسفی اقبال پر جتنی توجہ صرف ہوتی ہے، اتنی توجہ شاعر اقبال پر نہیں کی جاتی ــــ اقبالیات کی بحث میں اکثر و بیشتر اقبال کے تخلیقی اور شعری نظام کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے"۔ (گوپی چند نارنگ[۳۳]) یا: "ہمارے ادیب و نقاد، اقبال کی غنائی شاعری سے غضِ بصر کے عادی ہو گئے ہیں"۔ (نیاز فتح پوری[۳۴])۔ حفیظ ملک کی مرتبہ انگریزی کتاب: پوئٹ فلاسفر آف پاکستان شائع ہوئی تو، ظ انصاری نے اظہار افسوس کیا کہ اتنی اہم کتاب میں اقبال کے فن پر، نظریۂ فن پر، اس کی صوتیات، آہنگ اور ترنم پر کوئی شایانِ شان مضمون شامل نہیں[۳۵]۔ چنانچہ اس کوتاہی کی تلافی کے لیے اقبالی نقادوں کے ایک گروہ نے اقبال کے فکر سے بے نیاز رہتے ہوئے، ان کی شاعری کے فن کارانہ پہلو کو تبصرہ و تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے خیال میں اقبال کی شاعرانہ شخصیت کی پہچان، ان کی صناعی اور فنی ہنر مندی میں مضمر ہے۔ ان حضرات نے شعرِ اقبال کے رموز و علائم، صوتیاتی آہنگ، غنائیت، ڈرامائیت، محاکات، استعاروں اور تلازموں، تراکیب کے صوتیاتی حسن اور تنوع، لفظی تناسبات اور بعض کلیدی الفاظ کی معنویت پر زور دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اقبال نے اردو نظم کو بلوغ اور غزل کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اور جدید نظم کی تشکیل میں اپنی شاعرانہ عبقریت کا کمال دکھایا ہے اور یہ کمال، بطور خاص ان کی طویل نظموں میں ظاہر ہوا ہے۔ اقبالیات کے اس پہلو پر بھارت میں پاکستان سے کہیں زیادہ توجہ دی گئی۔ متعدد سیمی نار خاص اس موضوع پر

منعقد ہونے (اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) جن کے مقالات شائع ہو چکے ہیں[۴۶]—تاہم بطور شاعر، اقبال کا تجزیہ کرتے ہوئے، سب ناقدوں کا انداز نظر یکساں نہیں ہوتا ۔ بعض اصحاب (شمس الرحمان فاروقی، گیان چند، گوپی چند نارنگ، شکیل الرحمان وغیرہ) اقبال کے فکر سے ماورا ہو کر، محض ان کے فن سے بحث کرتے ہیں ۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، اس شاعر اقبال سے کلام کرتے ہیں، جو مفکر اور فلسفی بھی ہیں ۔ ان کے نزدیک :

> ''اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر تھے، نہ کہ فلسفی — ہاں وہ ایسے شاعر ضرور تھے، جو فلسفیانہ انداز نظر اور مفکرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے[۴۷]''۔

ڈاکٹر سنہا اور کلیم الدین احمد کے سوا (جنھوں نے اقبال کی شاعری کی تھوڑی بہت تعریف کی ہے، مگر ان کا مجموعی رویہ معاندانہ حد تک مخالفانہ ہے[۴۸]) تمام حلقوں نے اقبال کے بڑے اور عظیم شاعر ہونے کا اعتراف کیا ہے حتیٰ کہ عتیق صدیقی بھی (جن کے خیال میں اقبال کسی مرتب و منظم فلسفے سے نہیں تھے اور ان کی مذہبی بصیرت مشکوک تھی اور وہ عصر حاضر کے معاشی مسائل کا حل صرف سوشلزم میں مضمر سمجھتے تھے)، اقبال کو '' باکمال شاعر'' تسلیم کرتے ہوئے، مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ قول نقل کرتے ہیں : ''جدید ہندستان ان سے بڑا شاعر پیدا نہیں کر سکتا[۴۹]— لیکن سوال یہ ہے کہ اقبال کی عظمت کی بنیادیں کیا ہیں ؟ اور ان کی بڑائی، کیا محض ان کی فن کاری اور ان کے شعری و جمالیاتی امتیازات میں مضمر ہے ؟ یقیناً ایسا نہیں ۔ حیدر آباد سمپوزیم (اپریل ۱۹۸۶ء) میں جناب شمس الرحمان فاروقی نے ''اقبال کی شاعری میں استعارے کے عمل کی دریافت'' کے موضوع پر اپنی تقریر میں جب یہ کہا کہ ہم نے اقبال کو جو کچھ سمجھا اور جانا ہے، وہ ان کی شاعری کے حوالے سے ہے اور شاعر کے درجے اور پائے کا تعین استعارے کو برتنے پر ہوتا ہے— تو سرور صاحب نے جواب میں بہت صحیح فرمایا کہ محض علامتیں کسی شاعر کی عظمت کی دلیل نہیں ۔ اقبال، علاوہ شاعر ہونے کے، ایک بہت بڑے دانش ور بھی تھے اور ان کی شاعری میں ان کی دانش وری کی وجہ سے آب و تاب آئی[۵۰] ۔

فکر و نظر کا اشتراکی زاویہ رکھنے والے بعض نقادوں (سید احتشام حسین، علی سردار جعفری، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس اور اصغر علی انجینیر وغیرہ)

کے نزدیک اقبال کی دانش وری یا فکر ، بس اسی حد تک قابلِ قبول ہے ، جہاں تک اقبال اور اشتالیت کی قدریں مشترک ہیں ، اس سے آگے اقبال محض ایک آئیڈیا لسٹ تھے، ان کا تصورِ اسلام ہوٹو پیائی ہے اور وہ اپنے تضادات کے اسیر رہے[۵۱] ۔ چنانچہ ''شاعر اقبال'' پر غیر معمولی زور، ایک درجے میں ''مفکر اور مصلح اقبال'' کا ردِ عمل بھی ہے ۔ ''اقبال پرستوں نے ان کی فکر کو اتنی اہمیت دی کہ ان کا تاج محل ایک مزار رہ گیا'' ۔ (آل احمد سرور[۵۲]) بجا ، مگر ردِ عمل میں ڈاکٹر حکم چند نیر کی طرح حدِ اعتدال پار کر جانا بھی اقبال ناشناسی ہی قرار پائے گا ۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''اقبال کے کلام میں فلسفیانہ ، مذہبی اور سیاسی خیالات و افکار کی حیثیت محض ثانوی ہے ۔ ان امور کو ان کی شاعری سے نکال دیا جائے ، تو ان کی شاعری اور شاعرانہ عظمت کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا[۵۳] ''۔

شاعر اقبال اور مفکر اقبال کی بحث میں وارث علوی نے ایک متوازن نقطۂ نظر اختیار کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''اقبال کی شاعری پر لکھتے وقت ، ان کے افکار کو نظرانداز کرنا ، ان کی شاعری کی روح سے اغماض برتنا ہے ، لیکن یہ سمجھنا کہ ان کی عظمت کی دلیل ، ان کے افکار ہی ہیں، ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کو کم کرنا ہے[۵۴] ''۔

دراصل اقبال کی شاعری اور فکر لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اقبال شناسوں کا ایک گروہ (پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر عبدالحق اور بڑی حد تک جگن ناتھ آزاد) اسی متوازن و معتدل انداز فکر کا قائل ہے ۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کے خیال میں اقبال کے افکار نے ایسا طلسم قائم کر رکھا ہے کہ ان کے فن کی طرف، مشکل ہی سے کسی کی توجہ مبذول ہوتی ہے ۔ حالانکہ یہ طلسم درحقیقت فن ہی پر مبنی ہے ۔ اگر شاعری کو درمیان سے ہٹا دیا جائے ، تو افکار میں جو طلسم کی کیفیت ہے ، وہ ختم ہو جائے گی ۔ ڈاکٹر عبدالمغنی اقبال کی شاعری اور فکر و فن کے امتزاج کے نہ صرف قائل ، بلکہ پرجوش علمبردار ہیں ۔ اقبال کے نظام فن اور کلام اقبال کی فنی تنقید پر انھوں

نے ''اقبال کا نظامِ فن'' کے نام سے ایک پوری کتاب لکھ ڈالی ہے[۵۵] ۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری اپنے موقف کی وضاحت ، اپنے بعض مضامین کے علاوہ ''نقد و نظر'' کے اداریوں میں بھی کرتے رہے ہیں۔ ''نقد و نظر'' کے تازہ شمارے میں انھوں نے اقبال کے خیالات سے بے نیازی اور محض ''ان کی شاعری سے غرض'' کو ''ایک طرح کی سہل انگاری'' قرار دیا ہے ۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اقبال ''کے فن کو جو شے غذا پہنچاتی ہے یا اسے energize کرتی ہے ، وہ ان کا فکری رویہ ہے ، جو اسلامی نظامِ اقدار کی روشنی پر پلا بڑھا ہے[۵۶]'' ۔

بھارت کے ادبی جرائد میں ''نقد و نظر'' کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے ایک بہتر تنقیدی معیار کے ساتھ اقبال شناسی کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا ہے ۔ اس کی مسلسل چار اشاعتیں (اقبال نمبر) اقبالیات کے لیے وقف رہیں ۔ عام شماروں میں بھی اعلیٰ درجے کے تنقیدی مضامین ، تبصرے اور اقبال کی غزلوں اور نظموں کے تجزیے بڑی تعداد میں شامل رہے ہیں ۔

اقبال پر ڈاکٹر سنہا کی کتاب Iqbal : The Poet and His Message ۱۹۴۷ء میں اور مجنوں گورکھ پوری کی : اقبال (اجمالی تبصرہ) ۱۹۵۰ء کے آس پاس شائع ہوئی ۔ ان کتابوں نے اقبالیاتِ بھارت کی رجحان سازی میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ بدقسمتی سے سنہا اور مجنوں کا رویہ بڑی حد تک منفی تھا۔ چونکہ اقبالیات کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی گئی تھی ، اس لیے بعد ازاں اس پر تعمیر ہونے والی عمارت کی دیواروں میں ایک طرح کی ''کجی'' بہرحال موجود رہی ۔

بعض اہلِ قلم نے اقبال پر لکھتے ہوئے کچھ ایسا رویہ اپنایا ، جو اختلافِ رائے کا نہیں ، بلکہ مخالفت کی حدوں سے بھی آگے بڑھ کر تعصب ، ضد یا دشمنی کی نوبت کو پہنچ گیا ۔ ان میں ایک نام تو کلیم الدین احمد کا ہے ، جنھوں نے اقبال کو مغربی عینک سے دیکھا اور انھیں اقبال کی شاعری میں کوئی خوبی نظر نہیں آئی (اقبال ، ایک مطالعہ) ۔ ان کا جو جواب پروفیسر عبدالمغنی نے دیا (اقبال اور عالمی ادب[۵۷]) وہ بہت مناسب اور کلیم صاحب کے اعتراضات کے لیے کافی و شافی تھا ۔ دوسرا نام فراق صاحب کا ہے، جو اقبال سے بالکل ہی 'ناراض' معلوم ہوتے ہیں[۵۸] ۔ بلکہ ان کا انداز ناراضی سے زیادہ ضد اور پھر جھنجھلاہٹ کا ہے—مثلاً یہ رویہ کہ : ''جو بیداریِ شاعرِ مشرق اقبال یا ترجمانِ حقیقت اقبال

مسلمانوں کی کرالا چاہتے تھے ، وہ ایک چھوٹی سی ہانڈی میں ہاتھی کڑھی کے آبال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی "۔ یا "اقبال کے ساتھ تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ وہ انسانیت کے آسمان سے گرے تو امت و ملت کے کھجور میں اٹک گئے"۔ یقیناً کسی اچھے نقاد کا نہیں ہو سکتا[۵۹]— مجنوں اور فراق یا کلیم الدین احمد کا تو ایک ادبی مقام ہے ، مگر ایک اور صاحب ہیں : محمد عظیم فیروز آبادی (؟) موصوف کی اقبال شناسی ، اقبال اور ان کے والد کے نام و نسب میں کیڑے ڈالنے تک محدود رہی ہے ۔ ان کا مضمون "اقبال کی تاریخِ ولادت" ان کی ذہنی کجی ، اقبال سے ان کے تعصب اور بُغض و عداوت کی ایک مثال ہے ، جسے "شاعر" (اقبال نمبر ۱۹۸۸ء) نے "مقالۂ افتتاحیہ" کے طور پر چھاپا ہے ۔

فکرِ اقبال میں انسان دوستی کا ایک نمایاں رویہ اور اقبال کی شاعری کا آفاقی لب و لہجہ بھی بہت سے لوگوں کے لیے باعثِ کشش رہا ہے ۔ انسان دوستی ، چونکہ مذہب و ملت سے ماورا ایک تصور ہے ، اس لیے سیکولرزم کی فضا میں زیادہ قابلِ قبول ہے ۔ اقبال کے ایک مداح خواجہ غلام السیدین لکھتے ہیں :

> "اقبال کی فکرِ روشن کا سب سے اہم پہلو اس کی انسانیت اور انسان دوستی ہے اور اسی پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے[۶۰]" ۔

بہر حال یہ شعرِ اقبال کی ایسی خوبی ہے ، جسے مجنوں گورکھپوری سے لے کر علی سردار جعفری تک سب نے سراہا ہے ۔ کبھی کبھی اس خوبی کو سراہنے میں غلو بھی ہوتا جاتا ہے ("مسلمان قوم ، اقبال کی مخاطب برائے بیت ہے — اصل مخاطب انسان ہے" ۔ ساجدہ زیدی[۶۱]) مگر اس میں شبہ نہیں کہ بھارت میں اقبال کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ، ان کی یہی انسانیت نوازی اور انسان دوستی ہے ۔

(۶)

اقبال کی مفکرانہ حیثیت میں بڑا تنوع ہے ۔ اسی طرح ان کی شاعری کثیر الابعاد ہے اور اس کا ہر پہلو اپنے اندر ایک دل نواز کیف و کشش رکھتا ہے ۔ آپ جس زاویے سے چاہیں ، اسے سراہیں ، مگر اقبال کے ہاں آپ کو جو کچھ پسند نہیں ، اس سے انکار یا اس کی غلط تاویل ، اقبال ناشناسی کے مترادف ہے ۔ کسی مفکر یا شاعر سے سو فیصد ہم آہنگی ضروری نہیں اور نہ یہ ممکن

ہے ۔ فکر اقبال کے بعض رخ اہلِ بھارت کے لیے قابلِ قبول نہیں ، مثلاً : اقبال کے ہاں جداگانہ مسلم قومیت اور اسی حوالے سے تصورِ پاکستان — چنانچہ یہ ہرگز اقبال‌شناسی کا تقاضا نہیں کہ آپ اقبال کو ان کے پیش کردہ تصور پاکستان سے بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں ۔ یا مثلاً : اقبال کے ہاں دین و سیاست کی ہم آہنگی اور یکجائی پر جو زور دیا گیا ہے ، بھارتی اقبال شناس بالعموم اس سے تعرض نہیں کرتے ۔ ڈاکٹر وحید اختر کے نزدیک :

> ''اقبال کی فکر کے کئی عناصر ، ان کی فلسفیانہ اصطلاحات ، ان کی عجمی زبان اور عربی کے ، ان کی اسلامیت ، دین و ہنر و سیاست کی وحدت پر ان کا اصرار ، ان کے بعض سیاسی تعصبات ، مثلاً جمہوریت ، عورتوں کی تعلیم وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات اور ان کی ذاتی پسند و ناپسند کے کئی معیار ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے[۶۲]''۔

لہ سہی ، علی سردار جعفری نے بلاوجہ اس پر پریشانی ظاہر کی ہے[۶۳] ۔ پروفیسر ابو محمد سحر نے ایک متوازن بات کہی ہے کہ اقبال کو :

> ''شاعرِ اسلام کہنا غلط نہیں ، لیکن ان کی پرستاری یا مخالفت کے جوش میں انہیں صرف شاعرِ اسلام سمجھنا غلط ہے ، وہ شاعرِ ہندوستان بھی ہیں ، شاعرِ مشرق بھی اور شاعرِ انسانیت بھی[۶۴]''۔

(۷)

اوپر کی سطور میں ، کسی نہ کسی حوالے سے بہت سے اقبال شناسوں کا ذکر آیا ہے ۔ بھارت کے اقبالیین میں کچھ ایسے بزرگ اور عالم بھی ہیں ، جو شاعر اقبال ، محب وطن اقبال ، ملت پرست اقبال یا اسلام دوست اقبال سے صرف نظر کرتے ہوئے ، اقبال کی فکری و فلسفیانہ ، شعری و ادبی اور علمی و عالمانہ منہاج کے مطالعے میں مگن رہے ہیں : (کشتی کسی کی پار ہو یا درمیان رہے) ان میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، میکش اکبر آبادی، ڈاکٹر عالم خوند میری، پروفیسر وحید الدین ، ڈاکٹر غلام عمر خاں اور ڈاکٹر گیان چند شامل ہیں ۔ موخر الذکر، اقبال صدی کے زمانے میں اقبالیات کی طرف متوجہ ہوئے اور چند اعلیٰ پائے کے تحقیقی مقالے لکھنے کے بعد ، کچھ عرصہ پہلے انہوں نے ایک ضخیم کتاب ''اقبال کا ابتدائی کلام'' شائع کی ہے[۶۵] ۔

(۸)

بھارت میں اقبال کے متن پر بہت کم کام ہوا ہے۔ گیان چند کی متذکرہ بالا کتاب سے پہلے عبدالغفار شکیل کے مرتبہ دو مجموعے: ''نوادرِ اقبال'' (متروک کلام) اور ''اقبال کے نثری افکار[۶۶]'' (مضامین) چھپے، مگر متن کی تحقیق جس احتیاط اور دقتِ نظر کا تقاضا کرتی ہے، مرتب نے اس کا خیال نہیں رکھا۔ لہٰذا یہ حد درجہ غیر معیاری ہیں۔ سید مظفر حسین برنی کے ''کلیاتِ مکاتیب اقبال'' کی پہلی جلد، حال ہی میں شائع ہوئی ہے[۶۷]۔ متنِ اقبال کے ضمن میں یہ ایک بڑا اور اہم کام ہے۔

تراجم اقبال کے شعبے میں بہت کم کام ہوا ہے۔ اس ضمن میں صرف حیدرآباد کے مضطر مجاز نے سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ ان کی تین کتب تراجم ''جاوید نامہ''، ''ارمغان حجاز'' اور ''طلوعِ مشرق'' شائع ہو چکی ہیں[۶۸]۔ اسی طرح حوالہ جاتی کام بھی بھارتی اقبالیین کی توجہ حاصل نہیں کر سکے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا تیار کردہ اشاریہ ''بھارت میں اقبالیات[۶۹]'' غالباً اس سلسلے کا واحد کام ہے۔ انھی دنوں ڈاکٹر خلیق انجم نے ''کلیات مکاتیب اقبال'' پر تبصرہ کرتے ہوئے قرار دیا ہے: ''اقبال پر پاکستان میں بہت زیادہ کام ہوا ہے، لیکن معیاری اور بنیادی کام ہندستان میں ہو رہا ہے[۷۰]''۔ اس ضمن میں انھوں نے جگن ناتھ آزاد کی ''رودادِ اقبال'' اور متذکرہ کلیات کے نام لیے ہیں۔ یہ بات برسبیل تذکرہ کہی گئی ہو، تو کوئی حرج نہیں، مگر محض دو کتابوں کی بنیاد پر (جن میں سے ایک ابھی چھپی ہی نہیں اور دوسری کے ''معیار'' کا تجزیہ ہونا باقی ہے) اس طرح کا فیصلہ صادر کر دینا قرینِ انصاف نہیں۔ تحقیقِ متون اور حوالہ جاتی کاموں سے، اقبالیاتِ بھارت کا دامن بڑی حد تک خالی ہے۔ بھارت کے بعض جرائد (مثلاً: جامعہ، شیرازہ، ہما اردو ڈائجسٹ، سٹڈیز ان اسلام، نقد و نظر، شاعر[۷۱]) نے نہایت وقیع اقبال نمبر شائع کیے ہیں۔ نوادرات، مواد، تصاویر اور ضخامت کے اعتبار سے موخر الذکر ایک خوب صورت دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے اقبالیاتِ بھارت کا مزاج تحقیق و تدوین یا تراجم کے بجائے، تنقید و تجزیے کا ہے۔ یہاں تک کہ جامعات کے تحقیقی مقالوں میں بھی نقد و انتقاد کا رجحان ہی غالب ہے۔

(۹)

ایک آخری بات — !

ایک بڑے شاعر کو ، جو مفکرانہ لہجہ رکھتا ہو اور ہزار شیوہ بھی ہو، سمجھنے سمجھانے کے لیے کوئی ایک زاویۂ نظر کارآمد و کافی نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے ہاں فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی ایسی بوقلمونی ، رنگا رنگی اور تنوع موجود ہے کہ ہر شخص اقبال کو اپنی نگاہ اور اپنے زاویے سے دیکھتا ہے۔ پھر جہاں مسائل کو ، انفرادی احساس و تاثر سے قطع نظر ، مذہبی اور سیاسی و سماجی نظریات اور اجتماعی و قومی محسوسات کی سطح سے دیکھنے اور پرکھنے کا رجحان کارفرما ہو ، وہاں اقبال ایسے کثیر الجہت شاعر کی گونا گوں تعبیروں میں فطری ہیں۔ ایسے میں ہمیں توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ مثلاً : بھارت میں اقبالیات کی جو تعبیریں کی گئی ہیں ، وہ پاکستانی اقبالیات سے مماثل و مطابق ہوں۔ البتہ بھارت کے اقبال آشناؤں سے ہمارا یہ مطالبہ ضرور ہے کہ اقبال کی شاعری ، فن، فکر اور فلسفے کا، ایک کل کی حیثیت سے مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ اس کا مجموعی کم و کیف کیا ہے ؟

سرور صاحب نے ایک پتے کی بات کہی ہے کہ ہندستان میں جدید اسلام کا رول ، اچھی طرح سمجھنا ہو تو یہ کام اقبال ہی کے ذریعے پورا ہو سکتا ہے — اسی بات کو بہ الفاظِ دیگر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عہدِ جدید میں اقبال کی تفہیم کا ایک ذریعہ، اسلام اور علومِ اسلامیہ کا مطالعہ بھی ہے۔ اقبال کی اسلامیت ، قرونِ وسطیٰ کی پاپائیت ، جامد مذہبیت یا رہبانیت سے قطعی مختلف ہے۔ یہ ایک ایسا روشن خیال اور حیات افروز نظریہ ہے ، جو انسانیت نوازی، آفاقیت اور ہیو منزم کی بہترین قدروں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ درست ہے کہ اقبال کا ذہن ہندی ہے اور انھوں نے مغرب سے بھی بہت کچھ اخذ و کشید کیا ، مگر ان کا سرچشمۂ فکر قرآن ہے اور توحید و رسالت کے تصورات ان کے ہاں اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کی انسان دوستی کی جڑیں ، ان کی اسی بنیاد سے پیوستہ ہیں۔

اقبال کی ”حجازی لے“ اور ”عربی نوا“ سے بدکنے کی نہیں ، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال بھارت کا ماضی بھی ہے (اقبال ہندستان میں پیدا ہوئے اور یہیں پیوندِ خاک ہوئے ، اس کے باوجود) اہلِ بھارت لمحۂ حال میں بھی

اس کی آواز سن سکتے ہیں (فکرِ اقبال میں یقیناً عہد جدید کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے) اور میرا خیال ہے کہ مستقبل کے نئے تناظرات میں بھی اقبال اہلِ بھارت کے تجربات میں شریک رہتے ہوئے ، ان کے ہمدم و دم ساز بنے رہیں گے ۔

حوالے اور حواشی

۱ ۔ مجلہ : اوراق ، لاہور، جون ، جولائی ۱۹۸۹ء ، ص ۲۱۲-۲۱۳ ۔

۲ ۔ بہ حوالہ : کتابِ مذکور ، ص ۳۳ ۔

۳ ۔ مجلہ تناظر ، شمارہ ۲ ، دہلی ، ص ۶۱ ۔

۴ ۔ بہ حوالہ : روزنامہ ''انقلاب'' لاہور ، ۷ جنوری ۱۹۳۱ء ، بہ حوالہ : ''حیاتِ اقبال کے مخفی گوشے'' (مرتبہ : محمد حمزہ فاروق) ، لاہور ، ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان ، ۱۹۸۹ء ، ص ۳۳۳-۳۳۴ ۔

۵ ۔ بہ حوالہ : کتابِ مذکور، ص ۳۳۶ ۔ ۳۳۷ ۔

۶ ۔ ایضاً ، ص ۳۳۵ ۔

۷ ۔ تناظر ۲ ، ص ۲۰ ۔

۸ ۔ الہ آباد ، رام نرائن لال ، ۱۹۳۷ء ، ۳۶ + ۳۵۸ ص ۔

۹ ۔ گورکھ پور ، ایوانِ اشاعت ۔ س ن ، ۱۰۸ ص ۔

۱۰ ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ : ''مطالعۂ اقبال کے چند نئے رخ'' ، لاہور ، بزم اقبال، ۱۹۸۴ء ، ص ۲۸۳

۱۱ ۔ ایضاً ۔

۱۲ ۔ خدا بخش لائبریری جرنل ، شمارہ ۵۱ ، ۵۲ ، ۱۹۸۹ء ، پٹنہ ، ص ۱۶۲ ۔ سنہا کی کتاب کا ایک ادھورا محاکمہ، دیکھیے : ایم ایم شریف کا مضمون: ایک ناتمام خط ، در : About Iqbal and His Thought (لاہور ، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ، ۱۹۶۳ء) ۔

۱۳ ۔ اوراق ، شمارۂ مذکور ، ص ۲۱۲ ۔

۱۴ - ایضاً -

۱۵ - بھارت میں اقبالیات کی پہلی ربع صدی میں ڈاکٹر سنہا کی کتاب کے بعد، حسب ذیل کتابیں شائع ہوئیں :

۱۹۴۸ء : اقبال کامل (عبدالسلام ندوی) -

۱۹۵۰ء : تصوف اقبال (حبیب النساء بیگم) اقبال کی شاعری (عبدالمالک آروی) - طبع سوم)

۱۹۵۱ء : The Ardent Pilgrim (اقبال سنگھ) اقبال (اختر اورینوی) -

۱۹۵۲ء : روحِ اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) طبع سوم - مقام اقبال (اشفاق حسین) - اقبال کی کہانی ، کچھ میری ، کچھ ان کی زبانی (ڈاکٹر ظہیر الدین احمد الجامعی) -

۱۹۵۳ء : کلیاتِ اقبال اردو ، لکھنؤ -

۱۹۵۴ء : نقدِ اقبال (میکش اکبر آبادی) -

۱۹۵۵ء : حکمتِ کلیمی (ظفر احمد صدیقی) -

۱۹۵۶ء : روحِ اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) طبع چہارم -

۱۹۵۷ء : اصلاحاتِ اقبال (محمد بشیر الحق دسنوی) اقبال (اختر اورینوی) -

۱۹۵۸ء : اقبال سخن (رفیعہ سلطانہ) -

۱۹۵۹ء : تبرکاتِ اقبال (محمد بشیر الحق دسنوی) فلسفۂ اقبال (عبدالقوی دریا بادی) -

۱۹۶۰ء : اقبال اور اس کا عہد (جگن ناتھ آزاد) -

۱۹۶۱ء : حدیث اقبال (طیب عثمانی ندوی) -

۱۹۶۲ء : نوادرِ اقبال (عبدالغفار شکیل) روح اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) طبع پنجم - کلیات اقبال اردو ، مشورہ بک ڈپو دہلی -

۱۹۶۳ء : مرقع کلام اقبال (عصمت عارف دہلوی) -

۱۹۶۴ء : اقبال کا تصور عشق (ڈاکٹر غلام عمر خاں) - روح اسلام ، اقبال کی نظر میں (ڈاکٹر غلام عمر خاں) -

۱۹۶۵ء : اقبال، نئی تشکیل (عزیز احمد)

۱۹۶۶ء : اقبال کا تصور خودی (ڈاکٹر غلام عمر خاں) ۔
۱۹۶۷ء : علامہ اقبال ، بھوپال میں (عبدالقوی دسنوی) ۔
۱۹۶۹ء : اقبال کے ابتدائی افکار (ڈاکٹر عبدالحق) ۔
۱۹۷۰ء : نقوش اقبال (مولانا ابوالحسن علی ندوی) سوز اقبال (منور لکھنوی) ۔
۱۹۷۱ : اقبال کا فلسفۂ حیات و شاعری (قاضی محمد عدیل عباسی) ۔
۱۹۷۲ء : روح اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) ۔
۱۶ ۔ جگن ناتھ آزاد ، ایک مطالعہ (مرتبہ : محمد ایوب واتف) ، دہلی مونومینٹل پبلشرز ۱۹۸۸ء ، ص ۳۲۸ ۔
۱۷ ۔ اوراق ، شمارۂ مذکور ، ص ۲۱۳ ۔
۱۸ ۔ ایضاً، ص ۲۱۶ ۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ سجاد ظہیر کے ایک ہم مسلک دوست جناب علی سردار جعفری نے، اقبال کے حوالے سے فرقہ پرستی کا الزام لگانے والوں کے بارے میں کہا ہے کہ وہ محض ''سیاست کے نشے'' میں ایسا کرتے ہیں (اقبال شناسی ، دہلی ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۹۷۶ء ، ص ۲۲) ۔
۱۹ ۔ مجلہ سیفیہ ، خصوصی اشاعت ''یادگار اقبال'' بھوپال ۱۹۷۹ء - ۱۹۸۰ء ، ص ۲۸۳ ۔
۲۰ ۔ اوراق ، شمارۂ مذکور ، ص ۲۲۵ ۔
۲۱ ۔ ایضاً ، ص ۲۱۶ ۔
۲۲ ۔ ایضاً ، ص ۲۲۳ ۔
۲۳ ۔ ڈاکٹر عبدالحق : مجلہ سیفیہ ، اشاعتِ مذکور ، ص ۳۰ ۔
۲۴ ۔ اوراق ، اشاعتِ مذکور ، ص ۲۲۴ ۔
۲۵ ۔ ایضاً ، ص ۲۱۶ ۔
۲۶ ۔ فکر اقبال (مرتبہ : ڈاکٹر عالم خوند میری ، ڈاکٹر مغنی تبسم) ، حیدرآباد ، کل ہند اقبال صدی تقاریب کمیٹی ، ص ۱۲ - ۱۳ ۔
۲۷ ۔ Iqbal Commemorative Volume : نئی دہلی ، ص ۳ - ۱۲ ۔

۲۸ - فکر اقبال کے بعض اہم پہلو ، مرتبہ : جگن ناتھ آزاد ، سری نگر ، شاہین بک سٹال ، ۱۹۸۲ء ، ص ۲۱ -

۲۹ - اوراق ، مجلہ مذکور ، ص ۲۲۵ -

۳۰ - اقبالیات کی پہلی ربع صدی میں ، ڈاکٹریٹ کے لیے تحریر کردہ بعض مقالے:
*غلام عمر خاں : اقبال کا تصور انسان کامل ، شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ ۱۹۵۴ء ، ۳۸۲ ص -

*عالم خوند میری : Iqbal's Concept of Time and its Relation to Contemporary Thought [اقبال کا تصور زمان اور معاصر فکر سے اس کا تعلق] جامعہ عثمانیہ ، ۱۱ + ۳۱۳ ص -

*اکبر حسین قریشی: مطالعۂ تلمیحات و اشارات اقبال، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ، مطبوعہ : انجمن ترقی اردو علی گڑھ ، ۱۹۷۰ء ، ۳۴۶ ص -

*جمیلہ خاتون : The Place of God, Man and Universe in the Philosophical System of Iqbal ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ، مطبوعہ : اقبال اکادمی پاکستان ، کراچی ، ۱۹۶۳ء ، ۱۸۴ ص -

*ایم رفیق : Sri Aurobindo and Iqbal ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ، مطبوعہ : ۱۹۷۳ء ، ص ۱۲ + ۳۱۲ -

*عبدالحق: اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، مطبوعہ بہ عنوان: ''اقبال کے ابتدائی افکار'' پہاڑ پور ۱۹۶۹ء ، ۲۹۶ ص -

*آصف جاہ کاروانی : اقبال کا فلسفۂ خودی، الہ آباد یونی ورسٹی ۱۹۵۵ء، مطبوعہ : اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی ، ۱۹۷۷ء ، ۳۳۲ ص -

۳۱ - تفصیل دیکھیے : اردو تحقیق ، یونی ورسٹیوں میں از ڈاکٹر سید معین الرحمان ، لاہور ، یونی ورسل بکس ۱۹۸۹ء ، ص ۵۳ تا ۷۹ -

۳۲ - تفصیل دیکھیے : ''ایک یادگار عالمی اجتماع'' از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ، در : ''اقبالیات'' جولائی ۱۹۸۵ء -

۳۳ - تفصیل دیکھیے: ''اقبال بین الاقوامی سمپوزیم علی گڑھ'' در : اقبال اور احترام انسانیت (ڈاکٹر محمد ریاض) لاہور ، نذیر سنز ، ۱۹۸۹ء -

۳۴ - اقبال کا فن (مرتبہ : گوپی چند نارنگ) دہلی ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ، ۱۹۸۳ء ، ص ۱۳ -

۳۵ - دیکھیے : ماسٹر اختر کی تصانیف -

(۱) ریاست بھوپال اور اقبال : بھوپال ۱۹۸۷ء -

(۲) اقبال کے کرم فرما ؛ دہلی مونومینٹل پبلشرز، ۱۹۸۹ء -

۳۶ - علی سردار جعفری : اقبال شناسی ، ص ۲۱ -

۳۷ - عتیق صدیقی : اقبال جادو گر ہندی نژاد ، دہلی ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۹۸۰ء ، ص ۱۲۹ تا ۱۳۲ -

۳۸ - محب وطن اقبال - چنڈی گڑھ ، ہریانہ ساہتیہ اکادمی ۱۹۸۵ء ، ص ۱۴۸-

۳۹ - مثلاً دیکھیے : پروفیسر مشیر الحق کا مضمون : ''اقبال، اپنی شکست کی آواز'' در : اقبال کا شعور و فن (مرتبہ : قمر رئیس) دہلی ، شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی ۱۹۷۹ء - پروفیسر موصوف نے اقبال کے تصور پاکستان کو ان کی ''آواز شکست'' قرار دیتے ہوئے یہ طنز فرمایا ہے : ''اقبال کی آخری عمر کا یہ خواب ، ان کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں بعد پورا ہوا اور دنیا کے نقشے میں ایک نئے ملک کا اضافہ ہوا اور اس طرح ''عالم اسلام'' کا تھوڑا سا رقبہ اور بڑھا'' (ص ۵۲) -

۴۰ - پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا خیال ہے کہ اقبال نے پاکستان کا لفظ ، بے شک اپنے خطبۂ الہ آباد میں استعمال نہیں کیا تھا ، مگر قائداعظم کے نام ان کے دو تاریخی خطوط، اس مسئلے میں اقبال کے رویے پر، قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں (نقد و نظر ، ج ۱۰ ، ش ۱ ، ۱۹۸۸ء ، ص ۳۸، ۳۹) — جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں : ''جو لوگ تصور پاکستان کو ، فکر اقبال سے لاتعلق قرار دیتے ہیں ، ان کا مطالعۂ اقبال یا ادھورا ہے یا غیر دیانتدارانہ'' (فکر اقبال کے بعض اہم پہلو ، ص ۱۱۰) علی سردار جعفری کے خیال میں اہل بھارت کو ، پاکستان ، ایک حقیقت کے طور تسلیم کر لینا چاہیے (مجلہ : اقبالیات ، لاہور ، جولائی ۱۹۸۵ء ، ص ۲۷۱)-

۴۱ - تفاظر ۲ ، ص ۷۸ -

۴۲ - اقبال (اجمالی تبصرہ) ، ص ۸۳ -

۴۳ - اقبال کا فن ، ص ۷ -

۴۴ - نگار پاکستان ، کراچی ، جنوری ۱۹۶۲ء ، ص ۳ -

۴۵ - کتاب شناسی : بمبئی ، ۱۹۸۱ء ، ص ۱۸۵ -

۴۶ - جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سیمے نار " اقبال کا فن " (بحولہ بالا) میں شامل ہیں - اقبال السٹی ٹیوٹ کا شائع کردہ مجموعہ "اقبال اور اردو نظم" (سری نگر ۱۹۸۶ء ، ۱۲۰ ص) ایسے ہی مقالات پر مشتمل ہے . "اقبال کی شاعری اور شعریات" کے موضوع پر سیمے نار کے مقالات ، السٹی ٹیوٹ کے مجلے "اقبالیات" شمارہ ایک میں شامل ہیں -

۴۷ - نگار پاکستان ، شمارۂ مذکور ، ص ۱۳ -

۴۸ - ان کی کتاب "اقبال کا مطالعہ" کا مفصل جائزہ راقم نے اپنے ایک مضمون "بھاوت میں مطالعۂ اقبال ، دو زاویے" (اقبال ریویو ، لاہور ، جولائی ۱۹۸۴ء) میں لیا تھا -

۴۹ - اقبال ، جادو گر ہندی نژاد ، ص ۱۶ -

۵۰ - اقبالیات لاہور - جولائی ۱۹۸۵ء ، ص ۲۷۲ -

۵۱ - تفصیل دیکھیے : "اقبال جادوگر ہندی نژاد" ، جس میں مصنف نے جا بجا اقبال کے "تضادات" کی طرف اشارے کیے ہیں — نیز : "اقبال کا شعور و فن" (بحولہ بالا) میں پروفیسر محمد حسن اور اصغر علی انجینیر کے مضامین — وغیرہ -

۵۲ - اقبالیات ش ۳ ، سری نگر ، ص ۱۲ -

۵۳ - مطالعہ اقبال لکھنؤ ، اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۷۸ء ، ص ۱۱۵ -

۵۴ - اقبال کا فن : ص ۲۵۹-۲۶۰ -

۵۵ - مطبوعہ : پٹنہ ۱۹۸۴ء ، ۵۵۲ ص -

۵۶ ، نقد و نظر : ج ۱۱ ، ش ۱ ، ۱۹۸۹ء ، ص ۵ -

۵۷ - کلیم الدین احمد کی کتاب پر عبدالمغنی صاحب نے "اقبال اور عالمی ادب"

میں محاکمہ کیا ہے (پٹنہ ، کریسنٹ پبلی کیشنز ۱۹۸۲ء ، ۵۸۶ ص) ، سید مظفر حسین برنی کی کتاب ''محبِ وطن اقبال'' پر عبدالمغنی صاحب کا محاکمہ ، ان کی کتاب ''تنویر اقبال'' (لاہور، ۱۹۹۰ء) میں شامل ہے -

۵۸ - تناظر ۲ -

۵۹ - فراقی صاحب پر ایک محاکمہ دیکھیے: ''علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں'' از ڈاکٹر سلیم اختر ، در : ''شاعر'' بمبئی ، ج ۵۹ ، ش ۱۲ ، ۱۹۷۸ء -

۶۰ - آندھی میں چراغ : دہلی ، ترقیِ اردو بیورو ۱۹۸۲ء ، ص ۱۳۴ -

۶۱ - تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال : سری نگر ، اقبال انسٹی ٹیوٹ ۱۹۸۴ء ، ص ۶۷ -

۶۲ - مجلہ شیرازہ : سری نگر ، جلد ۱۹ ، شمارہ ۳ تا ۶ ، ص ۲۱ -

۶۳ - اقبال اور مغرب : سری نگر ، اقبال انسٹی ٹیوٹ ۱۹۸۱ء ، ص ۲۱۱ -

۶۴ - تنقید و تجزیہ : ص ۷۰ ، بہ حوالہ : مجلہ سیفیہ ، شمارۂ مذکور، ص ۱۲۲-

۶۵ - اقبال کا ابتدائی کلام : حیدر آباد ، اردو ریسرچ سنٹر ۱۹۸۸ء ، ۱۵ + ۵۹ ص -

۶۶ - نوادرِ اقبال : علی گڑھ ، سرسید بک ڈپو ۱۹۶۲ء ، ۲۳۸ ص - اقبال کے نثری افکار : دہلی ، انجمن ترقیِ اردو ۱۹۷۷ء ، ۲۸۲ ص -

۶۷ - دہلی ، اردو اکادمی ۱۹۸۹ء ، ۱۲۰۸ ص -

۶۸ - طلوعِ مشرق : حیدر آباد ، انجمن نمود ادب ۱۹۷۵ء ، ۹۲ ص - جاوید نامہ : حیدر آباد ، اقبال اکیڈیمی ۱۹۸۱ء ، ۱۸۴ ص - ارمغانِ حجاز : حیدر آباد ، ۱۹۷۷ء ، ۲۱۱ ص -

۶۹ - اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور ، س ن ، ۸۴ ص -

۷۰ - ہماری زبان : دہلی ، یکم جنوری ۱۹۹۰ء ، ۶ ص -

۷۱ - جامعہ : جنوری تا مارچ ۱۹۷۸ء ، ۱۵۹ ص - شیرازہ : جلد ۱۶ ، شمارہ ۳

تا ۶ ، ۲۳۰ ص - ہما اردو ڈائجسٹ دہلی : ۱۹۷۶ء ، ۳۵۶ ص - سنڈیزان اسلام ، دہلی : اپریل تا جولائی ۱۹۶۸ء ، ۱۹۶ ص - شاعر ۱۹۸۸ء ، ۶۳۹ ص -

---

ضروری وضاحت :

ممکن ہے بعض قارئین کو یہ کھٹک محسوس ہوئی ہو (مضمون لکھتے ہوئے خود راقم بھی الجھن محسوس کرتا رہا) کہ اقبالیاتِ کشمیر کا ذکر بھی "بھارت میں اقبالیات" میں شامل ہے — اس کی وضاحت ضروری ہے -

جموں و کشمیر کو اقوام متحدہ نے متنازع علاقہ قرار دیا تھا (اور متعلقہ قرارداد کو بھارت اور پاکستان دونوں نے تسلیم کیا تھا) اس وجہ سے قانونی طور پر اور اخلاق اعتبار سے بھی، یہ بھارت کا حصہ نہیں ہے اور اسی لیے دنیا کا کوئی باضمیر انسان ، خصوصاً ادیب اور قلم کار ، جموں و کشمیر کو دل سے بھارت کا حصہ تسلیم نہیں کرتا ، مگر عملاً یہ بھارت کے تصرف میں ہے — یوں ہم اسے فی الحال بھارت کے قبضے میں دیکھنے پر مجبور ہیں -

زیرِ نظر مضمون میں اقبالیاتِ کشمیر کا ذکر اسی مجبوری (جواز نہیں ، مجبوری) کے تحت کیا گیا ہے -

---

ڈاکٹر صدیق جاوید

اقبال کی نظم "مرزا غالب" کا تخلیقی محرک

دنیا کے مختلف خطوں میں جن لوگوں نے کسی نہ کسی عمرانی ادارے میں کوئی یادگار کردار ادا کیا ہے، انھیں نہ صرف اپنے ملک و قوم کی بلند پایہ بلکہ ایسی عظیم عالمی شخصیات کے فکر و عمل سے بھی شغف رہا ہے، جنھوں نے مذہب، سیاست، فلسفہ، سائنس، ادب اور ان کے ذیلی عمرانی اداروں کی نشو و نما، ترقی اور استحکام میں نمایاں خدمات اور عہد ساز کارنامے سرانجام دیے ہوتے ہیں۔ اقبال ایک ایسی ہی شخصیت کے مالک بنے جن کے افکار و تصورات نے ان کے عہد کے علاوہ مستقبل کی نسلوں کے دل و دماغ کو متاثر کیا لیکن اقبال کے کردار اور افکار، گویا ان کی شخصیت کی تشکیل میں عظیم ملکی اور گراں قدر عالمی شخصیات کے کن مؤثرات نے کیا حصہ لیا؟ یہ ایک ایسا ثمربار مطالعہ ہے جو فکر اقبال کی تفہیم میں بے حد معاون ہو سکتا ہے اور اس سے بعض صورتوں میں تو اقبال کے تخلیقی عمل پر روشنی پڑ سکتی ہے یا بعض منظومات کے تخلیقی محرکات کا پس منظر نمایاں اور واضح ہو سکتا ہے۔

اقبالیات میں اقبال کے شخصی حوالے سے جو کچھ بھی مواد فراہم ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کو اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف شخصیات سے رغبت رہی ہے ان میں بعض شخصیات سے انھیں ذاتی تعلق خاطر رہا، بعض ادبا، شعرا اور فلاسفر کے فکر و فن سے انھوں نے شعوری استفادہ کیا یا غیر شعوری طور پر اثرات قبول کیے، جن کا اقبال نے بعض موقعوں پر بالواسطہ اور بعض موقعوں پر بلاواسطہ اعتراف بھی کیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اقبال ابتدائے عمر ہی میں بطل پرستی (Hero Worship) کا جذبہ رکھتے تھے۔ یہ جذبہ خصوصاً لڑکپن اور نوجوانی میں طبیعت کا ایک فطری تقاضا ہے۔ اس جذبے نے اکثر نوجوانوں کی شخصیت کی تعمیر میں ایک

نفسیاتی محرک کا کام کیا ہے ۔ اس ضمن میں اقبال کی زندگی کے حوالے سے جو اولین ثبوت ریکارڈ پر ہے ، وہ مولانا احسن مارہروی کے نام ، اقبال کا گورنمنٹ کالج بورڈنگ ہاؤس سے ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء کا لکھا ہوا خط ہے ۔ اس خط سے اقبال کے ایک ایسے مشغلہ کا پتہ چلتا ہے جو ان کے ایک غالب طبعی رجحان اور افتاد طبع کے نفسیاتی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے ۔ اگر زیر نظر خط کی مندرجہ ذیل سطور کو بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو اقبال کے اس نفسیاتی رجحان اور ذہنی رویے کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے ۔ اقبال مولانا احسن مارہروی سے فرمائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"... اگر آپ کے پاس استاذی حضرت مرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمائیے گا کہ کہاں سے مل سکتی ہے ۔ میں نے تمام دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کیے ہیں ۔ چنانچہ انگریزی ، جرمنی اور فرنچ شعرا کے فوٹو کے لیے امریکہ لکھا ہے ۔ غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہوگا ۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو از راہِ عنایت جلد مطلع فرمائیے ۔ حضرت امیر مینائی کے فوٹوؤں کی بھی ضرورت ہے" ۔

اس اقتباس کے حوالے سے اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اقبال کو اس زمانے میں بھی انگریزی کے علاوہ جرمنی، فرنچ اور دنیا کے بڑے بڑے شعرا سے رغبت تھی ۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کو بین الاقوامی شہرت کے حامل شعرا کے احوال ، آثار ، افکار اور اشعار سے گہری واقفیت رہی ہوگی ۔ اگرچہ انگریزی بطور مضمون اقبال نے کالج میں بی اے کی سطح تک پڑھا تھا مگر معلوم ہوتا ہے انھوں نے اپنے ذاتی شوق اور ذوق کی بنا پر کلاسیکی اور روحانی و مابعد کے انگریزی ادب کا بالا ستیعاب مطالعہ کر لیا تھا ۔ دوسرے اس زمانے کے انگریزی شاعری اور ادب کے بعض منتخب مجموعوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک عام قاری کے سامنے بھی پوری خصوصاً انگریزی ادب اپنے پورے تناظر میں سامنے آ جاتا تھا ۔ بہرحال ایک اور روایت کے مطابق ، اقبال بی اے اور ایم ۔ اے کے زمانہ طالب علمی میں نہ صرف ملٹن کا مطالعہ کر چکے تھے بلکہ اس کی Paradise Regained کے نمونے پر واقعات کربلا منظوم کرنا چاہتے تھے ۔ مزید برآں اردو شاعری کی اصلاح و ترقی کے لیے مغربی شاعری کی تقلید کرنا چاہتے تھے ۔ زمانہ طالب علمی میں

اقبال کے قریبی دوست میر غلام بھیک نیرنگ بورڈنگ ہاؤس (گورنمنٹ کالج لاہور) کی سہ سالہ صحبتوں کی یاد آفرینی کے ضمن میں لکھتے ہیں :

> ''ہاں ایک بات ضرور لکھنے کے قابل ہے ۔ ہماری ان سہ سالہ صحبتوں میں Paradise Lost اور Paradise Regained کا ذکر کرکے کہا کرتے تھے کہ واقعات کربلا کو ایسے رنگ میں نظم کروں گا کہ ملٹن کی Paradise Regained کا جواب ہو جائے۔ مگر اس قیود کی تکمیل کبھی نہیں ہو سکی ۔ میں اتنا اور کہہ دوں کہ اردو شاعری کی اصلاح و ترقی کا اور اس میں مغربی شاعری کا رنگ پیدا کرنے کا ذکر بار بار آیا کرتا تھا[۲]''۔

میر غلام بھیک نیرنگ کے بیان کی تائید اقبال کے ایک خط سے فراہم ہوتی ہے ۔ علامہ اقبال ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء کو منشی سراج الدین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

> ''. . . ملٹن کی تقلید میں کچھ لکھنے کا ارادہ مدت سے ہے اور اب وہ وقت قریب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان دنوں وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا جس میں اس کی فکر نہ ہو ۔ پانچ چھ سال سے اس آرزو کو دل میں پرورش کر رہا ہوں مگر جتنی کاوش آج کل محسوس ہوتی ہے اس قدر کبھی نہ ہوئی ۔ فکرِ روزگار سے نجات ملتی ہے تو اس کام کو باقاعدہ شروع کروں گا[۳]''۔

اس اقتباس کے علاوہ کئی دوسرے خارجی اور داخلی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ کے علاوہ اقبال یورپی ادب سے نہ صرف واقف تھے ، بلکہ اس سے اخذ و استفادہ بھی کرتے تھے ۔ فطری طور پر وہ شعر و ادب کے یورپی زمانے کے احوال اور فکر و نظر کے سلسلوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ انھوں نے ان مغربی شعرا کی ''شاعری اور شاعرانہ لائف'' پر متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا تھا ۔ فروری ۱۹۰۳ء میں اقبال نے کسی اخبار میں دیکھا کہ امیر مینائی کی کوئی سوانح عمری موجود نہیں تو انھوں نے خود امیر مینائی کی لائف قلم بند کرنے کا ارادہ کیا ۔ لہٰذا انھوں نے مواد کی فراہمی کے لیے ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء کے ہفتہ وار اخبار پنجۂ فولاد لاہور میں ایک طویل مراسلہ شائع کرایا ۔ جس کے وسط میں اظہار تاسف کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں :

"آہ ایسے بے نظیر شخص (امیر مینائی) کے حالات ، جو اصل معنوں میں تلمیذ الرحمان کہلانے کا مستحق ہو ، ابھی تک گمنامی میں پڑے رہیں ، اندھیر نہیں تو اور کیا ہے ؟ اگر یہی شخص یورپ یا امریکہ میں ہوتا تو اس کی زندگی میں ہی اس کی کئی سوانح عمریاں نکل جاتیں مگر افسوس ہے ہندوستان میں ان کی زندگی میں تو درکنار ، ان کی وفات کے بعد بھی ان کی کوئی لائف نہ لکھی گئی"۔

اس اخباری مراسلے کے آخر میں اقبال نے "امیر کی شاعری اور شاعرانہ لائف پر بحث کرنے" کے لیے سات باتیں امیر کے تلامذہ اور دیگر واقف کاروں سے دریافت کیں ۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ :

"حضرت امیر کی کوئی ایسی بات جس نے ان کی زندگی یا شاعری پر کوئی خاص اثر کیا ہو"۔

اس استفسار سے ایک بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اقبال کو سوانح عمری کے فن سے دلچسپی تھی اور وہ تفہیم ادب و فن میں اس کی اہمیت اور افادیت کے قائل تھے نیز یہ کہ سوانح عمری سے دلچسپی بطل پرستی کی غماز ہے ۔ دوسرے یہ کہ اقبال شعر و ادب کا مطالعہ تنقیدی نظر سے کرنے کے عادی رہے ہوں گے اور یہ کہ تحسینِ شعر میں فطری ذوق کے علاوہ مشرق و مغرب کی ادبی اقدار خصوصاً نقد و نظر کے معیار ان کے پیش نظر رہتے تھے بہرحال اہم ترین بات یہ ہے کہ علامہ اپنی علمی ، ادبی اور تخلیقی زندگی کے آغاز ہی میں واقعات زندگی کے ردِ عمل کو یا تاثرات اور شعری و تخلیقی محرکات کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اقبال نے شروع ہی سے اساتذہ کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا ۔ متذکرہ صدر مکتوب و اخباری مراسلہ کے اقتباسات کے علاوہ اقبال نے اپنے ابتدائی اشعار میں بھی داغ و امیر کو خراج تحسین پیش کیا ہے ۔ احسن مارہروی کے نام ۱۸۹۹ء کے مکتوب سے پہلے ایک طرحی مشاعرہ میں داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے اپنی غزل کے مقطع میں کہتے ہیں :

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخنداں کا[۶]

باقیات اقبال میں ایک اور غزل ہے جس کے مقطع میں داغ کی کرامت کا

قرینہ پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں :

جناب داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی

علامہ اقبال اپنے استاد میرزا داغ کی وفات پر بہت آزردہ ہوئے انھوں نے منفرد اور مؤثر انداز میں داغ کا مرثیہ کہا - داغ کے اٹھ جانے سے اردو شاعری کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا اس کا بھی اس مرثیہ میں اظہار کیا - یہ مرثیہ رسالہ مخزن لاہور کے شمارہ اپریل ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا[۸]. لیکن امیر مینائی کی لائف اور شاعری پر انگریزی میں مضمون لکھنے کی خواہش اور ارادے کو علامہ بوجوہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے - تاہم امیر مینائی کی شخصیت اور ان کی فنی عظمت کا احساس ۱۹۰۵ء تک اقبال کے دل و دماغ پر مستولی رہا ، مثلاً مخزن ستمبر ۱۹۰۲ء میں شائع شدہ نظم ''سرگذشت آدم'' میں حسب ذیل شعر بھی تھا :

عجیب شے ہے ''صنم خانۂ امیر'' اقبال
میں بت ارحت ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے[۹]

اس شعر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان برسوں میں امیر مینائی اقبال کے شعور و لاشعور کا زندہ و پائدار عنصر تھے - یہ شعر کسی طور بھی متذکرہ نظم کے نفس مضمون سے تعلق نہیں رکھتا ، نہ اس نظم کے کسی سیاق و سباق میں اس کی کوئی مناسبت ہی دکھائی دیتی ہے - شاعر کی لاشعوری کیفیت کے سوا ، اس شعر کے وجود کی کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی - اسی طرح داغ کے مرثیہ کا مندرجہ ذیل دوسرا شعر اقبال کی نفسیاتی کیفیت کا غماز تو ہے ہی علاوہ ازیں اس امر کا بھی مظہر ہے کہ وہ اگر داغ پر امیر مینائی کو فوقیت نہیں دیتے تھے تو دونوں کو برابر کی سطح پر ضرور دیکھتے تھے :

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر

بہرحال یہ تو ثابت ہوا کہ اقبال امیر مینائی سے ذہنی اور جذباتی سطح پر بہت متاثر تھے ''پنجۂ فولاد'' کے متذکرہ مراسلہ میں اقبال نے یہ بھی لکھا تھا:

''حضرت امیر کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ وہ

صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ان کا درجہ شاعری سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد اور ایک خاص قسم کی لے پائی جاتی ہے، جو صاحب دلوں کو بے چین کر دیتی ہے اور وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں[10]"۔

کلام امیر کی اثر پذیری کے باوجود اقبال امیر مینائی پر نہ کوئی مضمون لکھ پائے اور نہ باقاعدہ منظوم خراج تحسین ہی پیش کر سکے۔ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ امیر مینائی سے اقبال کا جذباتی رشتہ ایسا تخلیقی تجربہ نہ بن پایا کہ وہ کسی معمولی سے تخلیقی محرک کے باعث یوں اظہار پاتا جیسے مل کا سینہ چیر کر جیورنا پھوٹ بہتا ہے۔ قربت اس کے برعکس ستمبر ۱۹۰۱ء تک غالب کی بابت اقبال کے ہاں کوئی ہرملا جوش اور جذبہ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ الگ بات ہے کہ اقبال کی فنی نشو و نما اور شاعرانہ تہذیب و قرابت میں غالب کا فیضان کہیں اقبال کے سکول کے زمانہ میں شروع ہو گیا تھا[11]۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ کلام غالب اقبال کی شاعرانہ اور فنی شخصیت کا جزو اعظم ہے گویا کلام غالب اقبال کے تخلیقی تجربہ کا ایک حصہ تھا اس کے باوجود اقبال کی نظم مرزا غالب (جو رسالہ مخزن لاہور کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی اور بانگ درا کے مندرجات میں اس نظم کا نمبر چوتھا ہے) کسی زبردست تخلیقی محرک کی محتاج رہی۔ جہاں تک ہم نے دیکھا ہے اس تخلیقی محرک کی کسی اقبال شناس یا غالب شناس نے نشاندہی نہیں کی حالانکہ اس نظم کے اندر ہی ایک اشارہ موجود ہے جو اس نظم کے تخلیقی محرک کے سراغ میں راہنمائی کر سکتا تھا ہماری مراد اس نظم کے تیسرے بند کے آخری شعر سے ہے جس کے پہلے مصرعہ میں شارحین کے مطابق غالب کو گوئٹے کا ہم نوا قرار دیا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے اقبال نے خود حاشیہ میں ویمر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس جگہ مدفون ہے"۔ مشہور جرمن اقبال شناس ڈاکٹر این میری شمل نے بھی اپنے مضمون "اقبال اور گوئٹے" میں میرزا غالب پر اقبال کی نظم کے حوالے سے لکھا ہے:

"...It is evident from his beautiful poem in honour of Ghalib, who, says Iqbal, rests in the dust of Delhi. While his spiritual brother Goethe slumbers in the rose-garden of Weimar"[12].

اس حوالے سے شمل نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سیاسی وجوہ کی بنا پر ہندی مسلمان غالب طور پر انگریزی ادب کی روایت تک محدود رہے۔ اقبال ایک استثنیٰ ہے۔ گوئٹے کے لیے اقبال کی محبت ان کے گیریر کے آغاز (یعنی میرزا غالب پر نظم) سے ظاہر ہے[۱۳]۔ شمل کے اس بیان سے اس بات کا تعین نہیں ہوتا کہ اقبال جرمن ادب سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کس حد تک واقف تھے۔ کیا مرزا غالب پر نظم میں گوئٹے کا یہ کنایۃً حوالہ اقبال کی سرسری واقفیت کے نتیجہ میں اور روا روی میں وارد ہو گیا ہے؟ یا اقبال گوئٹے کے احوال و آثار سے گہری واقفیت رکھتے تھے؟ سردست کوئی ٹھوس شواہد نہیں ملتے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاید گوئٹے کے تعارف میں میتھامس آرنلڈ کا حصہ ہو یا انگریزی شعرا و ادبا کی تحریروں میں گوئٹے کے حوالوں سے متاثر ہو کر اقبال نے گوئٹے کے سوانح اور گوئٹے کے شعری و ادبی تراجم وغیرہ پر مبنی اس مواد تک رسائی حاصل کی ہو جو انگریزی زبان میں موجود تھا۔ مثلاً انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں کارلائل اور مل کا ہندوستان میں ذوق و شوق سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اس لیے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اقبال نے طالب علمی کے زمانے میں کارلائل کے مشہور سلسلۂ خطبات پر مشتمل کتاب (Heroes and Hero-Worship) نہ پڑھی ہو اور خصوصاً اس کتاب کے پانچویں خطبے بعنوان The Hero as a Man of Letters کی مندرجہ ذیل سطور پڑھ کر تامل نہ کیا ہو۔ اس کے علاوہ کارلائل کی اس کتاب کے دوسرے خطبات میں بھی کئی جگہ گوئٹے کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اقبال جیسے فلسفہ و ادب کے زیرک اور متجسس طالب علم نے گوئٹے کے احوال و آثار پڑھے بغیر چین لیا ہو۔ اگرچہ کارلائل کے اس (محولہ) خطبہ کا موضوع جانسن، روسو اور برنز ہیں مگر اس نے گوئٹے کا ضمناً ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "In this point of view, I consider that for the last hundred years by far notablest of all Literary Men is Fichte's countryman, Goethe. To that man too, in a strange way, there was given what we may call a life in the Divine Idea of the World, vision of the inward divine mystery: and strangely, out of his books the world rises imaged once more as godlike

---

۱ - یہ خطبہ بروز منگل ۱۹ مئی ۱۸۴۰ء کو دیا گیا، ص ۲۰۳-۲۰۰

workmanship and temple of a God. Illuminated all, not in fierce impure fire-*splendour as of* . . . ., but in mild celestial radiance ;—really a Prophecy in these most unprophetic times; to my mind, by far the greatest, though one of the quietest, among all the great things that have come to pass in them. *Our chosen specimen of the Hero as Literary Man would be this Goethe. And it were a very pleasant plan fot me here to discourse of his heroism : for I consider him to be a true Hero* ; heroic in what he said and did, and perhaps still more in what he did not say and did not do ; to me a noble spectacle : a great heroic ancient man, speaking and keeping silence as an ancient Hero, in the guise of a most modern high-bred highcultivated Man of Letters ! We have had no such spectacle ; no man capable of affording such, for the last hundred-and-fifty years[14].

بہرحال اقبال کی نظم و نثر اور ملفوظات وغیرہ میں گوئٹے کا کنایۃً حوالہ پہلی بار ۱۹۰۱ء میں مرزا غالب پر نظم میں ہی آیا ہے۔ البتہ اقبال اور گوئٹے پر لکھنے والوں نے اسے گوئٹے سے اقبال کی دلچسپی کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے۔ اس کے بعد گوئٹے سے اقبال کی دلچسپی کے آثار میں اضافہ ہوتا چلا گیا مثلاً ۱۹۰۷ء میں ویگے ناست کے ساتھ مل کر فاؤسٹ مطالعہ کرنے کا ذکر آتا ہے[۱۵] ۱۹۱۰/۱۱ء کے دوران میں اقبال کے نوٹس پر مبنی ڈائری (Stray Reflections[16] (ترجمہ: شذرات فکر اقبال[۱۷]) کے نو شذرات میں گوئٹے کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں اقبال نے گوئٹے کے اثرات کا اعتراف کیا ہے اور اس کی عظمت کو خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں پیام مشرق شائع ہوئی جس کا ذیلی اور وضاحتی عنوان ہے ''در جواب دیوان شاعر المانوی گوئٹے''۔

اقبال نے نظم کے درج ذیل شعر میں غالب کو گوئٹے کا ہمنوا قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

یہ محض حسن اتفاق ہے کہ اقبال نے (جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے) حاشیہ میں ویمر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

''ویمر : جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس جگہ مدفون ہے[۱۸]''۔

بصورت دیگر اقبالیات میں ایک اور مناقشے اور تنازعے کا امکان تھا کیونکہ جرمنی کا ایک اور بلند پایہ شاعر اور مشہور ڈرامہ نویس شلر (۱۸۰۵ء/۱۷۵۹ء) کا ۹ مئی ۱۸۰۵ء کو ویمر میں انتقال ہوا اور وہ بھی ویمر میں ہی مدفون ہے ۔ شلر نے اپنی عمر کے آخری دس سال ویمر میں گوئٹے کے نہایت قریبی دوست کی حیثیت سے گزارے[۱۹] ۔ لہٰذا اقبال کی وضاحت کی عدم موجودگی میں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے جس سے ''گلشن ویمر کے خوابیدہ'' سے قطعی طور پر گوئٹے ہی مراد لیا جا سکے ۔ اس کے برعکس صورت حال ''مرزا غالب'' پر نظم کے تیسرے بند کے دوسرے شعر میں پیدا ہو گئی ہے ۔
شعر یہ ہے :

شاہد مضمون آصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ''غنچۂ دلی'' اور ''گل شیراز'' دو استعارے ہیں۔ نظم کے عنوان، تناظر اور شعر کے سیاق و سباق سے 'غنچۂ دلی' کا استعارہ تو واضح ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی سہولت کے ساتھ 'غنچۂ دلی' سے سبھی شارحین مرزا غالب مراد لیتے ہیں ۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسی مصرع میں ''گل شیراز'' کا استعارہ کس کے لیے ہے ؟ اس کے بارے میں اقبال کے شارحین کے ہاں قطعیت اور یقین کا فقدان ہے ، مثلاً شارح اول یوسف سلیم چشتی زیر نظر نظم کے حل لغات و تشریح ترا کیب کے ذیل میں لکھتے ہیں :

''گل شیراز سے مراد ہے حافظ اور سعدی کی شاعری[۲۰]''۔

وہ آئندہ صفحات میں دوسرے بند کی وضاحت کرتے ہوئے زیر تبصرہ شعر کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں :

''تیرے (خطاب بہ غالب) کلام میں اس قدر حلاوت اور شیرینی ہے کہ اس کے سامنے حافظ کا رنگ بھی پھیکا معلوم ہوتا ہے[۲۱]''۔

جناب رازی کے مطابق ''گل شیراز'' ''خواجہ حافظ یا شیخ سعدی جو فارسی کے نامور شاعر تھے دونوں کا وطن شیراز تھا''—— آگے چل کر تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے :

''— تیرے کلام میں حافظ سے زیادہ شوخی و رندی اور سعدی سے بڑھ کر لطافت و پاکیزگی پائی جاتی ہے[۲۲]''۔

ڈاکٹر محمد باقر کہتے ہیں :

''غالب کو دلی کا غنچہ کہا ہے اور شعرائے ایران کو شیراز کے پھول سے تشبیہ دی ہے[۲۳]''۔

مولانا غلام رسول مہر کے مطابق :

''گل شیراز سے اشارہ حافظ شیرازی کی طرف ہے — چوتھے مصرعے میں غالب کو حافظ شیرازی کے لیے باعث رشک بتایا ہے[۲۴]''۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بانگ درا کے فاضل شارحین کی اکثریت گل شیراز کا استعارہ / کنایہ تعین کے ساتھ حافظ کے لیے استعمال نہیں کرتی ۔ اگرچہ مولانا مہر نے گل شیراز سے حافظ شیرازی مراد لیا ہے مگر اس کے لیے کوئی استدلالی جملہ استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ۔ راقم الحروف نے اپنے ایک مقالہ بعنوان ''تنقید غالب میں اقبال کا حصہ[۲۵]''۔ میں ایک مقام پر اقبال کی زیر نظر نظم کی روشنی میں کلام غالب کی سولہ خصوصیات گنوائی ہیں ۔ چودھویں خصوصیت قرار دینے میں متذکرہ شارحین کی رائے کا تاثر کارفرما ہے ۔ اس مقالہ میں زیر نظر خصوصیت کا اندراج صرف اس قدر ہے :

حافظ و سعدی سے مقابلہ :

ع خندۂ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر[۲۶]

شارحین کے علاوہ اقبال کے عام اور خاص قارئین پر بھی زیر بحث کنایہ / استعارہ واضح نہیں ۔ اس کا اندازہ جناب صابر کلوروی نے ، جو اقبال پر چار کتابوں کے مرتب ہیں اور جنہوں نے باقیات اقبال پر چند ماہ پیشتر (غالباً

ستمبر ، اکتوبر ۱۹۸۹ء میں) ای ایچ لی کا مقالہ بھی پیش کیا ہے ، راقم کے نام اپنے مکتوب (مورخہ ۹ اگست ۸۸ء) میں لکھا :

''(اقبال پر تحقیقی مقالے ، کے) ، ص ۵۰ (پر)[1] اقبال اور غالب کے موازنے میں آپ نے علامہ کے ایک مصرعے :

ع خندہ زن ہے غنچۂ دلی ، گلِ شیراز پر

سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علامہ ، حافظ شیرازی اور سعدی شیرازی کو سراج (سراہ) رہے ہیں ۔ آپ عرفی شیرازی کو کیوں بھول گئے ؟ میرا موقف ہے کہ اس شعر سے علامہ کی مراد وہ نہیں ہے ، جو آپ سمجھ رہے ہیں ۔ شعر کو سیاق و سباق کے ساتھ ایک دفعہ پھر پڑھیے ۔ پورا بند دیکھیے ۔ علامہ ، غالب کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں اور اس شعر میں اچانک کس طرح غالب کو غائب فرض کیا جا سکتا ہے ، غالب کو غنچہ کہنا اور حافظ یا سعدی کو گل کہنے میں غالب کی توقیر میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ کمی ہوتی ہے ۔

غنچۂ دلی سے مراد اردو ہے اور گل شیراز سے مراد فارسی ہے ، اردو نے اپنا اسلوب دلی کی مدد سے پروان چڑھایا تو فارسی نے شیراز سے ۔ اقبال کے زمانے میں فارسی اور اردو میں نسبت کو ٹھیک طور پر گل اور غنچے سے واضح کیا ہے ۔ اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ غالب ہی تھے جن کے دم سے اردو شاعری اب فارسی شاعری کے قریب تر آ گئی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہے ۔ مجھے اپنی تشریح پر اصرار نہیں ہے آپ کو پسند آئے تو ٹھیک ورنہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے اس مسئلے کو فیصل کروا لیجیے'' ۔

اس موقع پر اقبال کی نظم صقلیہ کا یہ شعر یاد آتا ہے :

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر

---

۱ ۔ واوین کے اندر ، قوسین راقم نے لگائے ہیں ۔

یہاں بلبلِ شیراز کا استعارہ بالکل واضح ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا قرینہ موجود ہے کہ بلبل شیراز سے شیخ سعدی کے سوا کوئی دوسرا شخص مراد نہیں لیا جا سکتا۔ شیخ سعدی نے سقوط بغداد پر اپنا مشہور مرثیہ قلم بند کیا تھا۔

اس کا پہلا شعر یہ ہے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد برزمیں
بر زوالِ ملک مستعصم امیر المومنیں

--- (داغ) نے ۱۸۵۷ء کی بربادیٔ دہلی کا مرثیہ لکھا تھا۔ دہلی کی بربادی کے مرثیے بہت سے شاعروں نے لکھے تھے... اقبال نے داغ کا ذکر غالباً اس لیے کیا کہ سب سے اچھا مرثیہ انہیں کا مانا گیا تھا[۲۶ا]'' --- یوں گل شیراز اور بلبل شیراز میں یکتائی کا کوئی تلازمہ دکھائی نہیں دیتا۔ بہرحال اس استعارے سے بھی کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے میں مدد نہیں ملتی۔

سید عابد علی عابد نے تلمیحات اقبال میں ''گل شیراز'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس تلمیح کا مخاطب دریافت کرنا ذرا مشکل ہے اس اعتبار سے کہ غالب اصلاً غزل گو ہے، گل شیراز سے مراد حافظ ہونی چاہیے کہ وہ بھی اصلاً غزل گو ہے۔ قصیدہ ضمناً لکھتا ہے لیکن اقبال حافظ کے کلام کو مسلمانوں کے لیے خاص طور پر مہلک تصور کرتا ہے اس لیے گمان یہی ہو سکتا ہے کہ گل شیراز سے مراد سعدی ہے۔ صقلیہ میں سعدی کو بلبل شیراز کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس سے بات پھر مشتبہ ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سعدی کی ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے شاید گل شیراز سے مراد حافظ لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے، خاص طور پر جب اور جگہ اس کے لیے علامہ نے بلبل کا اشارہ استعمال کیا ہے[۲۶ب]''۔

اتفاق سے خود اقبال کی ایسی تحریریں موجود ہیں جو اس مسئلہ کو فیصل کرنے اور زیر بحث کنایہ / استعارہ کے تعین میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ بہرحال غنچہ دلی اور گل شیراز والے بند کے سیاق و سباق سے یہ تو واضح ہی ہے کہ

غنچہ' دلی سے غالب مراد ہے مگر وہ ''گل شیراز'' پر خندہ زن کیوں کر ہے؟ اقبال کو مذکورہ خندہ زنی کا احساس کس نہاد پر ہے ؟ اس کا جواب اقبال کے کئی مقامات نظم و نثر سے فراہم کیا جا سکتا ہے ہم یہاں ''شذرات فکر اقبال'' کے دو شذرات پر استشہاد کے لیے اکتفا کریں گے ۔

اقبال نے ایک شذرہ میں (بزبان انگریزی) لکھا ہے :

''میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل ، گوئٹے ، مرزا غالب ، عبدالقادر بیدل اور ورڈزورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے ۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیا کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔ بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے الگ سمو لینے کے باوجود ، اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈزورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے فطرت سے بچا لیا[۲۷]'' ۔

دوسرا شذرہ بصورت ترجمہ ، حسب ذیل ہے :

''میری رائے میں مرزا غالب کا فارسی کلام ، شاید مسلمانانِ ہند کی جانب سے وہ واحد پیشکش ہے، جس سے ملت کے عام ادبی سرمائے میں کوئی مستقل اضافہ ہوا ہے ۔ غالب یقیناً ان شعرا میں سے ہے جن کا ذہن اور تخیل انہیں مذہب اور قومیت کے تنگ حدود سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے ۔ غالب شناسی کا حق ادا ہونا ابھی باقی ہے[۲۸]'' ۔

مندرجہ بالا چلے شذرہ میں اقبال نے جن پانچ شخصیات سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے ان میں حافظ اور سعدی شامل نہیں ، کیا اقبال ان دو عظیم شعرا سے متاثر نہ تھے ؟ ان دونوں اساتذہ سے اقبال کا متاثر نہ ہونا بعید از قیاس ہے ۔ کیونکہ اس سلسلے میں کئی شواہد فراہم کیے جا سکتے ہیں ۔ البتہ ان شواہد میں حافظ کی سعدی پر ترجیح اور فوقیت نظر آتی ہے ۔ لہٰذا پہلے یہاں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اقبال حافظ کی تخلیقی شخصیت سے کس حد تک متاثر ہوئے ؟ اور اقبال کے فکر و فن پر حافظ کے کس قدر گہرے اثرات ہیں ؟ اس موضوع پر کافی وقیع کام ہو چکا ہے[۲۹] ۔ تاہم یہاں زیر قلم مقالہ کی ضرورت

کے مطابق حافظ کی بابت اقبال کے اعتراف پر مشتمل چند سطور پیش کی جاتی ہیں ۔ عطیہ بیگم نے لندن میں یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو اپنی ڈائری قلم بند کرتے ہوئے اقبال سے اپنی پہلی ملاقات کے دوران میں تاثرات و مکالمات کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"—(اقبال) حافظ کے زیادہ شائق معلوم ہوتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حافظ کے حافظ تھے ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ، جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں ، اس وقت ان کی امپرٹ مجھ میں آ جاتی ہے اور میں خود تھوڑی دیر کے لیے حافظ بن جاتا ہوں" ۔ مجھے بھی حافظ کا کلام یاد تھا ۔ اسے سناتی رہی[۳۰]"۔

اس کے بعد ۲۰ جون ۱۹۰۷ء کی ڈائری کا اقتباس ملاحظہ کیجیے :

"آج شام کو اقبال چند عربی اور جرمن فلاسفروں کی کتابیں لائے اور سب میں سے تھوڑا تھوڑا سنایا...فارسی شعرا میں زیادہ تر حافظ کا کلام سناتے رہے[۳۱]..."۔

اقبال نے اسرار خودی کی پہلی اشاعت میں حافظ کے بارے میں چند اشعار بھی درج کیے تھے جس پر تصوف سے دلچسپی رکھنے والے علمی حلقوں کی طرف سے سخت رد عمل سامنے آیا ۔ اقبال نے "اسرار خودی اور تصوف" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں حافظ پر اپنے اعتراض اور تنقید کی وضاحت کی ہے ۔ یہاں اس مضمون کا وہی اقتباس پیش کیا گیا ہے جس میں اقبال نے حافظ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے ۔
ملاحظہ کیجیے :

"شاعرانہ اعتبار سے میں حافظ کو نہایت بلند پایہ سمجھتا ہوں جہاں تک فن کا تعلق ہے یعنی جو مقصد اور شعرا پوری غزل میں بھی حاصل نہیں کر سکتے خواجہ حافظ اسے ایک لفظ میں حاصل کرتے ہیں ۔ اس واسطے کہ وہ انسانی قلب کے راز کو پورے طور پر سمجھتے ہیں . . . اور شاعری نام ہی اس کا ہے کہ اشیاء و مقاصد کو اصلیت سے حسین تر بنا کر دکھایا جائے تاکہ اوروں کو ان اشیاء و مقاصد کی طرف توجہ ہو اور قلوب ان کی طرف کھنچ آئیں ۔

ان معنوں میں ہر شاعر جادوگر ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کا جادو کم چلتا ہے کسی کا زیادہ ۔ خواجہ حافظ اس اعتبار سے سب سے بڑے ساحر ہیں[۳۲]"۔

اب ہم حافظ سے گوئٹے کا ذہنی و روحانی تعلق دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ غالب ، حافظ اور گوئٹے کی مثلث کے خطوط اور زاوے نمایاں اور واضح ہو سکیں اور ہم یہ تعین کا دعویٰ کر سکیں ۔ اس سلسلے میں ہمیں پیام مشرق (۱۹۲۲ء) کے دیباچہ سے رجوع کرنا پڑے گا اور کسی قدر طویل اقتباس گوارا کرنا ہوگا ۔
اقبال لکھتے ہیں :

"پیام مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن " حکیم حیات " گوئٹے کا "مغربی دیوان" ہے . . . اور گوئٹے کا یہ مجموعہ اشعار جو اس کی بہترین تصانیف سے ہے اور جس کو اس نے خود دیوان کے نام سے موسوم کیا ہے کن اثرات کا نتیجہ تھا اور کن حالات میں لکھا گیا اس سوال کا جواب دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختصر طور پر اس تحریک کا ذکر کیا جائے جس کو المانوی ادبیات کی تاریخ میں "تحریک مشرق" کے نام سے یاد کرتے ہیں . . .

۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا ۔ گوئٹے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن قوم کا انحطاط پہلے سے انتہا تک پہنچ چکا تھا ۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لیے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرق فضا کے امن و سکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا ۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا۔ جس نے آخرکار "مغربی دیوان" کی ایک پائدار اور مستقل صورت اختیار کر لی ۔ مگر فان ہیمر کا ترجمہ گوئٹے کے لیے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ اس کے عجیب و غریب تخیلات کا ماخذ بھی تھا ۔ بعض جگہ اس کی نظم خواجہ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوت تخیل کسی خاص مصرع کے اثر سے ایک

نئی شاہراہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے ۔ گوئٹے کا مشہور سوانح نگار بیل سوشکی لکھتا ہے :

''بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی ۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے ۔ وہی زمینی مسرت ، وہی آسمانی محبت ، وہی سادگی ، وہی عمق ، وہی جوش و حرارت ، وہی وسعت مشرب ، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی ! غرضکہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں ۔ جس طرح حافظ لسان الغیب و ترجمان اسرار ہے اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے اسی طرح گوئٹے کے بے ساختہ بن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں ۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراج تحسین وصول کیا ۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (یعنی حافظ نے تیمور[1] کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے'' ۔

خواجہ حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے خیالات میں شیخ عطار ، سعدی، فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے ۔ ایک آدھ جگہ ردیف و قافیہ کی قید سے غزل بھی لکھی ہے ۔ اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی (مثلاً ''گوہر اشعار'' ، ''تیر مژگاں'' ، ''زلف گرہ گیر'') بے تکلف استعمال کرتا ہے بلکہ فارسیت کے جوش میں امرد پرستی کی طرف اشارات کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتا ۔ دیوان کے مختلف حصوں کے نام بھی فارسی ہیں ، مثلاً مغنی نامہ ،

---

۱ ۔ خواجہ حافظ اور تیمور کی ملاقات کی روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ خواجہ کا انتقال تیموری فتح شیراز سے پہلے ہو چکا تھا ۔

ساقی نامہ ، عشق نامہ ، تیمور نامہ، حکمت نامہ وغیرہ ۔ باوجود ان سب باتوں کے گوئٹے کسی فارسی شاعر کا مقلد نہیں اور اس کی شاعرانہ فطرت قطعاً آزاد ہے ۔ مشرق کے لالہ زاروں میں اس کی نوا پیرائی محض عارضی ہے ۔ وہ اپنی مغربیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور اس کی نگاہ صرف انہیں مشرقی حقائق پر پڑتی ہے جن کو اس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے ۔ عجمی تصوف سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی اور گو اسے یہ بات معلوم تھی کہ مشرق میں خواجہ حافظ کے اشعار کی تفسیر تصوف کے نقطۂ نگاہ سے کی جاتی ہے ۔ وہ خود تغزل محض کا دلدادہ تھا اور کلام حافظ کی صوفی تعبیر سے اسے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ مولانا روم کے فلسفیانہ حقایق و معارف اس کے نزدیک مبہم تھے ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے رومی کے کلام پر غائر نگاہ نہیں ڈالی کیونکہ جو شخص سپونوزا (ہالینڈ کا ایک فلسفی جو مسئلہ وحدت الوجود کا قائل تھا) کا مداح ہو اور جس نے برونو (اٹلی کا ایک وجودی فلسفی) کی حمایت میں قلم اٹھایا ہو اس سے ممکن نہیں کہ رومی کا معترف نہ ہو ۔

غرضیکہ ''مغربی دیوان'' کی وساطت سے گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی''[۳۳] ۔

پیام مشرق کے دیباچہ کا بین السطور تو کیا اس کا سرسری مطالعہ بھی یہ شہادت فراہم کرتا ہے کہ جرمن سکالرز اور اقبال کے نزدیک گوئٹے حافظ کی شاعری اور فن سے متاثر تھا ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اقبال گوئٹے کو حافظ کے مقابلے میں عظیم و برتر خیال کرتا ہے ۔ اس کا جواب ایک تو ''اسرار خودی اور تصوف'' کے زیر عنوان مضمون میں موجود ہے ۔

جس میں وہ کہتے ہیں :

> ''. . . وہ (حافظ) ایک ایسی کیفیت کو محبوب بناتے ہیں جو اغراض زندگی کے منافی ہے بلکہ زندگی کے لیے مضر ہے جو حالت خواجہ حافظ اپنے پڑھنے والے کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں (یعنی بحیثیت صوفی ہونے کے) وہ حالت افراد و اقوام کے لیے جو اس زمان و مکان کی دنیا میں رہتے ہیں ، نہایت ہی خطرناک ہے ۔ حافظ کی دعوت موت کی طرف ہے جس کو وہ اپنے کمالِ فن سے شیریں کر دیتے ہیں تا کہ مرنے والے کو اپنے دکھ کا احساس نہ ہو''[۳۴]۔

اس کے برعکس علامہ گوئٹے کو ''حکیم حیات'' قرار دیتے ہیں کیونکہ گوئٹے نے اپنے ادبی نصب العین کو فراموش نہیں کیا اور حافظ سے شدید متاثر ہونے کے باوجود اس کا مقلد نہیں بنا (دیکھیے زیر نظر مضمون ص ۵۳) ۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال نے شذرات فکر اقبال کے شذرہ نمبر ۳۶ (دیکھیے زیر نظر مضمون ص ۴۹) میں ہیگل ، گوئٹے ، غالب ، ہیگل اور ورڈزورتھ سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے مگر اس فہرست میں حافظ کو شامل نہیں کیا ۔ ذرا تامل کرنے پر وہ تعجب رفع ہو جائے گا جو ''گل شیراز'' پر غنچۂ دلی گویا غالب کو حافظ پر ، نظم میں اقبال کی فوقیت دیکھ کر پیدا ہوتا ہے اور وہ پراسرار تعلق اور ربط نہانی واضح ہو جاتا ہے جو غالب اور گوئٹے کو ہم نوا قرار دینے کا باعث ہے ۔ نظم کے سیاق و سباق اور مندرجہ بالا اقتباس از دیباچہ پیام مشرق کے سیاق و سباق میں گل شیراز کے تعین کی کوشش میں ایک ثبوت سے مدد ملتی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے وجدانی ہے ، گویا نظم مرزا غالب کے متعلقہ (تیسرے) بند کا بنظر غائر جائزہ لینے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نظم کا تخلیقی محرک آخری شعر کا آخری مصرعہ :

ع گلشن ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

ٹھہرتا ہے ۔ ہم آئندہ صفحات میں اس موضوع پر گفتگو کریں گے کہ متذکرہ مصرعہ نہ صرف اس بند کا بلکہ پوری نظم کا تخلیقی محرک کیوں کر ہے ۔ یہاں ضمناً اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر زیر بحث تیسرے بند کے مطالعہ میں تجزیہ و تحلیل اور منطق و استدلال کو بروئے کار لائیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ اپنی نظم مرزا غالب کی تخلیق کے وقت یعنی ستمبر ۱۹۰۷ء میں گوئٹے کے احوال و آثار سے عموماً اور خصوصاً گوئٹے کی حافظ سے دلچسپی و رغبت سے پوری طرح باخبر تھے اور اسی حوالے سے ''جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک'' کے بارے میں بھی وہ قابل لحاظ معلومات رکھتے تھے ۔ جرمن ادب کی تاریخ اور روایت سے اس زمانے میں اقبال کی واقفیت قرین قیاس ضرور ہے ۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس علم و آگہی کو اقبال کی نظم کا تخلیقی محرک قرار دیا جا سکتا ہے ؟

دراصل تخلیقی محرکات کے مطالعہ میں اہم ترین بات یہ ہے کہ کسی فن پارے کے تخلیقی محرک کی بالتخصیص نشاندہی کے بغیر بات قابل یقین نہیں بنتی ۔

علامہ اقبال کی نظم مرزا غالب کے بارے میں یہ بات دعوی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کا تخلیقی محرک ایک ایسی انگریزی نظم ہے جس کی تاریخ تخلیق تو اپریل ۱۸۵۰ء ہے مگر یہ نظم ۱۸۵۲ء سے شاعر کے مختلف مجموعوں میں چھپ رہی ہے[۳۵] ۔ یہ نظم شاعر کی چند مشہور اور مقبول نظموں میں سے ہے اس لیے عام طور پر انگریزی نظموں کے منتخبات میں شامل ہوتی رہتی ہے ۔ ۱۸۹۸ء کا ایک انتخاب موسوم بہ Poet's Work مرتبہ Mowbray Morris شائع کردہ میکملن کمپنی لندن ہمارے پیش نظر ہے ۔ ایک مشہور انتخاب (Fifteen Poets) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے جنوری ۱۹۴۱ء میں شائع کیا تھا اس وقت سے اس مجموعہ کے قانونی اور غیر قانونی ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں ۔ یہ مجموعہ بھارت اور پاکستان کی یونیورسٹیوں خصوصاً پنجاب یونیورسٹی لاہور میں انگریزی بی اے آنرز اور اس کا ایک حصہ (Eight Poets) کے نام سے انگریزی بی اے لازمی کے نصاب میں کم و بیش گذشتہ تیس اینتیس سال سے ، چند مختصر وقفوں کو چھوڑ کر ، شامل چلا آ رہا ہے ۔ ان دنوں بھی یہ مجموعے بی اے کے دونوں نصابوں میں پڑھائے جاتے ہیں اور جس نظم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ دونوں مجموعوں گویا پندرہ شعرا اور آٹھ شعرا میں شامل ہے ۔ اس نظم کا خالق انگریزی زبان و ادب کا اتنا اہم شاعر اور نقاد ہے کہ انگریزی ایم اے کے طلبا اور انگریزی ادب کے سنجیدہ قارئین کی نظر سے یہ نظم یا اس کے حوالے اوجھل نہیں ہو سکتے — اب تک جس نظم کا نام لینے سے گریز کیا گیا ہے وہ میتھیو آرنلڈ (۱۸۲۲—۸۸ء) کی مشہور نظم (Memorial Verses; April 1850) ہے ۔ یہ نظم چوبیس سطروں پر مشتمل ہے اور چھوٹے بڑے آٹھ بندوں میں تقسیم ہے اس کا پہلا بند پانچ مصرعوں یا سطروں پر مشتمل ہے ۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس بند کی دو لائنیں یعنی پہلی اور چوتھی لائن ، اقبال کی دو مشہور نظموں کی تخلیق کا محرک ہیں ۔

یہ بند ملاحظہ فرمائیے :

Goethe in Weimer sleeps, and Greece,
Long since, saw Byrons's struggle cease
But one such death remain'd to come
The last poetic voice is dumbe...
We stand to-day by Wordsworth's tomb.

اس بند کی پہلی لائن کی گونج اقبال کے مصرع :

ع گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

میں اتنی صاف سنائی دیتی ہے کہ ذہن لامحالہ اقبال کی نظم مرزا غالب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اس لائن نے اقبال کی نظم کی تخلیقی تکمیل میں کیا کردار ادا کیا ؟ یہ تخلیقی عمل کی ہر اسرار نوعیت اور آرنلڈ کی نظم کی پوری فضا کو ذہن میں رکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح چوتھی لائن اقبال کی داغ پر نظم کی تخلیق میں کس حد تک مؤثر رہی ؟ یہ امر نظم داغ کے پہلے بند کے آخری مصرع :

ع آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اور آرنلڈ کے متذکرہ بند کی چوتھی لائن کے تقابل سے واضح ہے ۔ مگر علمائے اقبالیات کے ہاں آرنلڈ کی نظم کی پہلی لائن اور نظم کے مجموعی تاثر کا ، اقبال کی زیر نظر نظم کے تخلیقی عمل میں فیضان کا احساس نہیں پایا جاتا ۔ اس سلسلے میں حوالوں وغیرہ کا قوی امکان ، فٹ نوٹ میں درج مضامین اور کتابوں میں تھا۔ کیونکہ ان تصانیف کے کئی مصنف یا مؤلف انگریزی ادب کے متبحر عالم،

---

1. Iqbal : The Poet and his Message by Dr. S. Sinha, 1947. ۔ ا
2. Iqbal : His Art and Thought; S.A. Vahid, 1959, 1969.
3. Poetry of Iqbal. Sir Zuliflqar Ali, 1922, 1977.
4. Studies in Iqbal. S. A. Vahid (Includes article : Iqbal and Goethe) 1967.
5. Iqbal : Essays and Studies, ed. Asloob Ahmad Ansari (Includes Schimmel's article : Iqbal and Goethe), 1978.
6. The Poet of the East. A. Beg, 1939, 1961.
7. Western Influence in Iqbal T.C. Rastogi, (1987).
(Ch 18. Iqbal and Goethe)·

۸ ۔ علامہ اقبال (ممتاز حسن کی نظر میں) : مرتبہ ڈاکٹر محمد معز الدین (۱۹۸۱ء) ۔

رسالہ شعور ، کراچی (ساتواں ۱۹۵۹ء) ۔

۹ ۔ اقبال اور مغربی مفکرین ، جگن ناتھ آزاد (س ۔ ن) ۔ مکتبہ عالیہ ، لاہور (باب : ۱۰ اقبال اور گوئٹے) ۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

جید استاد ہونے کے ساتھ اردو کے معتبر نقاد اور محقق تھے ۔ پھر معلوم نہیں کیوں انھیں :

ع کاشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

میں (Goethe in Weimer Sleeps) کی بازگشت ب کہ سنائی دی ۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

۱۰ ۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری پروفیسر حمید احمد خاں (مجموعہ مقالات : مقالہ : اقبال اور انگریزی شعرا) ۱۹۷۳ء ۔

یہ مقالہ ۱۹۵۳ء میں ای ۔ بی ۔ سی لندن سے نشر ہوا اور نئی تحریریں نمبر میں شائع ہوا ۔

11. Journal of the Research Society of Pakistan. Lahore. Oct, 1977. (Article : Iqbal's Borrowings from English Poems by Dr. Muhammad Sadiq).

۱۲ ۔ مطالعہ تلمیحات و اشاراتِ اقبال ، ڈاکٹر اکبر حسین قریشی ۱۹۸۶ء ۔ (باب نہم : اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ) ۔

ب ۔ دو تین سال قبل زیر نظر مقالہ کی تسوید ہو چکی تھی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے ارشاد پر رسالہ اقبال کے لیے مسودہ صاف کرتے ہوئے اس مرحلہ پر پہنچا تو حسن اتفاق سے ڈاکٹر محمد شفیق احمد کی شرح بانگ درا (پہلا حصہ) کی ڈسی نظر پڑی ، نظم مرزا غالب کی تشریح میں آرنلڈ کا حوالہ دیکھ کر خوشی ہوئی ۔ اخلاقیات تحقیق کے مطابق راقم الحروف ان کی اولیت کا اعتراف کرتا ہے چونکہ وہ یہ حوالہ مطبوعہ صورت میں دیکھ چکا ہے اس لیے ریکارڈ پر لانا ضروری ہے ۔ ڈاکٹر محمد شفیق احمد اپنی وضاحت میں لکھتے ہیں :

"اقبال اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس قدر عظیم شاعر اس دلی میں دفن ہے جو اجڑ چکی ہے لیکن ویسا ہی عظیم شاعر کوئٹے دہلی سے ہزاروں میل دور جرمنی کے مشہور شہر ویمر میں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ڈاکٹر محمد صادق انگریزی ادب کے مشہور و معروف استاد تھے انھوں نے اردو تنقید و تحقیق میں خاصا وقیع کام کیا ہے۔ انگریزی زبان میں ان کی ہسٹری آف اردو لٹریچر اور Twentieth Century Urdu Literature جیسی تصانیف موجود ہیں۔ انھوں نے ورڈ زورتھ پر آرنلڈ کی نظم (Memorial Verses) کو اقبال کے مرثیہ داغ کا ماخذ قرار دیا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خارجی شہادت کے ذریعہ آرنلڈ اور اقبال کی نظموں میں مماثلت اور مشابہت تلاش کی ہے اور داخلی شہادت کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ جس کی نشاندہی ہم گذشتہ سطور میں کر چکے ہیں۔ ہماری مراد آرنلڈ کی لائن The Last poetic voice is dumb اور اقبال کے مصرع:

ع آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

محو خواب ہے۔ علامہ اقبال نے آرنلڈ کی ایک نظم سے یہ مصرع اخذ کیا ہے آرنلڈ کا مصرع ہے۔ Goethe sleeps in Wiemmer"[۳۶]

یہ اطلاع ڈاکٹر صاحب موصوف کی شنید معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے آرنلڈ کی نظم کا عنوان نہیں بتایا۔ انگریزی مصرعہ کی ترتیب درست نہیں، ویمر کا املا غلط ہے۔ انھوں نے اقبال کی داغ پر نظم کو آرنلڈ کی اس نظم کے ساتھ مربوط کر کے بھی نہیں دیکھا۔ اسی طرح غنچہ دلی اور گل شیراز کے استعاروں کی جو وضاحت انھوں نے کی ہے وہ قابل توجہ ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

"اقبال کا خیال ہے کہ غالب نے ایسی خوبصورت شاعری کی ہے کہ اب غنچہ دلی، گل شیراز کا مذاق اڑا رہا ہے۔ بعض شارحین اقبال کے نزدیک غنچہ دلی سے مراد غالب اور گل شیراز سے مراد خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی ہیں۔ اس کے علاوہ ان دو تراکیب کے معنی علی الترتیب زبان اردو اور زبان فارسی بھی ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہوئے کہ غالب کی بدولت اردو جیسی کم ترقی یافتہ زبان میں بھی ایسی شاعری ہو چکی ہے جس کے سامنے فارسی شاعری پھیکی اور بے رنگ لگتی ہے"[۳۷]۔

ہے ۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اپنے مضمون (Iqbal's Borrowings From English Poems) میں کہا ہے کہ داغ کی وفات پر اقبال کی نظم ، آرنلڈ کی "میموریل ورسز" کے نمونے پر ہے ۔

وہ لکھتے ہیں :

"The poem on the death of Dagh is modeled on Mathew Arnold's Memorial Verses. The likeness in thought is too palpable to be missed. Here is Arnold :

Goethe in Weimer sleeps and Greece.
Long since, saw Byron's struggle cease.
But one such death remains to come,
The last poetic voice is dumb.

Others will teach us how to dare,
And against fear our breast to steal :
Others will strengthen us to bear—
But who, ah, who will make us feel ?
The cloud of mortal destiny,
Others will front it fearlessly—
But who like him will put it by?

And here is Iqbal :

عظمت غالب، ہے اک مدت سے ماتم زمیں
مہدی مجروح ہے شہر خموشاں کا مکیں

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر

آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے
شمع روشن بزم سخن ماتم میں ہے

چل بسا داغ آہ میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اور دکھلائیں گے معنوں کی یہی باریکیاں
اپنے فکر نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخی دوراں کے نقشہ کھینچ کر دکھلائیں گے
یا تخیل کی ہمیں دنیا نئی دکھلائیں گے

وہ بھو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون[۳۸]

جابر علی سید (مرحوم) بھی آرنلڈ کی نظم کو صرف داغ پر مرثیہ کا محرک یا ماخذ خیال کرتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

"داغ کا انتقال ۱۹۱۰ء [۱۹۰۵ء] میں ہوا جس کا غیر فانی مرثیہ اقبال نے لکھا۔ اس مرثیے کا تصور میتھیو آرنلڈ کے اس مرثیے پر مبنی ہے جو آرنلڈ نے ورڈزورتھ کی موت پر لکھا۔ اقبال نے ابتدائی مرثیہ میں انگریزی شعرا کی بجائے اردو شعرا کے نام رکھ دیے ہیں۔ غالب، مہدی مجروح، امیر مینائی[۳۹]"۔

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے پی ایچ ڈی کے لیے اپنے تحقیقی مقالے کی دوسری اشاعت (۱۹۸۶ء) میں بعض اضافے کیے تھے۔ اس مقالہ کا باب نہم "اقبال کی بعض نظموں کے ماخذ" پر مشتمل ہے، ڈاکٹر قریشی نے اس میں اقبال کی نظم داغ نقل کرنے کے بعد آرنلڈ کی نظم "میموریل ورسز" نقل کی ہے اس کے بعد مندرجہ ذیل سطور پر مبنی نوٹ لکھا ہے:

"داغ کا مرثیہ پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ غالباً یہ مرثیہ لکھتے وقت اقبال کے تحت الشعور میں ان نغموں کی گونج باقی تھی جو Wordsworth کی وفات سے متاثر ہو کر آرنلڈ (Arnold)

کے مضراب دل سے نکلے تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ چونکہ داغ اور ورڈزورتھ کی شخصیتیں فکر و فہم اور ذہنی و جذباتی توانائی اور وسعت کے اعتبار سے اور شعری مذاق اور پیام کے لحاظ سے بمراحل دور ہیں ، اس لیے دونوں مرثیے ہمارے اندر یکساں رد عمل کو بیدار نہیں کر سکتے ، تاہم ان دونوں مرثیوں میں مماثلت کے اور پہلو بھی نکل سکتے ہیں : اول تو یہ کہ دونوں مرثیوں کی فنی ترتیب و تشکیل میں خاصی مشابہت پائی جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ داغ کی شخصیت کے محدود ہونے کے باوجود اقبال ان سے جس طرح اور جس حد تک متاثر ہوئے ، ان تاثرات کو انھوں نے اتنی ہی والہانہ عقیدت ، پختگی اور جذباتی شدت کے ساتھ بیان کیا ہے جو آرنلڈ کے مرثیے میں نمایاں ہے[۳۹]"۔

ایک تو ہمیں اس تبصرہ کی جزئیات سے اتفاق نہیں ۔ لیکن یہاں اس اختلاف کے اظہار کا محل نہیں ۔ دوسرے اخلاقیات تحقیق کے حوالے سے یہ احتجاج ریکارڈ کرانا ضروری ہے کہ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے ڈاکٹر محمد صادق کی تحقیق کو بغیر اعتراف اور حوالہ کے اپنا لیا ہے اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر اکبر قریشی ، ڈاکٹر محمد صادق کی طرح آرنلڈ کی پہلی لائن کو اقبال کی نظم غالب سے مربوط نہیں کر سکے اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ڈاکٹر اکبر قریشی اپنے طور پر یہ ماخذ دریافت کر چکے تھے تب بھی ڈاکٹر محمد صادق کی اولیت برقرار رہتی ہے اور ڈاکٹر اکبر قریشی پر واجب تھا کہ وہ ڈاکٹر محمد صادق کا حوالہ دیتے ۔ جملہ معترضہ برطرف آرنلڈ اور ورڈزورتھ کے ذہنی اور قلبی تعلق کو جاننے کے لیے کم از کم مندرجہ ذیل معلومات ضروری ہیں :

"ورڈزورتھ کا ۸۰ سال کی عمر میں ۲۳ اپریل ۱۸۵۰ء کو انتقال ہوا[۴۰] ۔ آرنلڈ نے ورڈزورتھ کا مرثیہ "میموریل ورسز" اپریل ۱۸۵۰ء میں لکھا[۴۱] گویا اس نے ورڈزورتھ کی وفات کے بعد ۲۳ اپریل سے ۳۰ اپریل کے دوران میں یہ نظم کہی۔ آرنلڈ ورڈزورتھ کو شخصی طور پر جانتا تھا اور اس کی نگارشات کو بے حد پسند کرتا تھا اس کا ثبوت اس مرثیہ کے علاوہ ورڈزورتھ پر آرنلڈ کا وہ مضمون ہے جو اس نے ۱۸۷۹ء[۴۲] میں قلم بند کیا ۔ گوئٹے کا

انتقال ۱۸۳۲ء میں ہوا۔ آرنلڈ اُسے انیسویں صدی کے اوائل کا عظیم فلسفی شاعر خیال کرتا تھا[۳۴]۔"

اقبال کی مرزا غالب پر نظم میں صرف آرنلڈ کے مرثیہ کے تاثرات کارفرما نہیں بلکہ آرنلڈ کے ورڈزورتھ پر تنقیدی مضمون کے اثرات بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ آرنلڈ نے یہ مضمون ورڈزورتھ کی منتخب نظموں کو مرتب کرتے ہوئے دیباچہ کے طور پر ۱۸۷۹ء میں لکھا جو اس کے تنقیدی مضامین (Essays In Criticism, Second Series) اشاعت اول ۱۸۸۸ء[۳۵] میں شامل ہے۔ اقبال نے آرنلڈ کی زیر بحث نظم اور مضمون کا کس ترتیب سے مطالعہ کیا اس کا تعین مشکل ہے۔ البتہ نظم مرزا غالب کا توجہ سے مطالعہ کرنے کے بعد قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے آرنلڈ کی نظم اور مضمون سے گہرے اثرات قبول کیے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اقبال نے مرزا غالب کی تخلیق کے قریبی زمانے میں آرنلڈ کی نظم اور مضمون کا دوسری تیسری بار مکرر مطالعہ کیا ہو یا نظم کی تخلیق کے وقت انگریزی نظم اور مضمون کے مطالب اقبال کے تحت الشعور یا لاشعور سے نکل کر شعور کی سطح پر آ گئے ہوں۔ بہرحال داغ پر اقبال کی نظم سے تو یہی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ آرنلڈ کی نظم سے اقبال اس حد تک متاثر تھے کہ یہ نظم علامہ کی دو یادگار نظموں کا محرک ثابت ہوئی۔ آرنلڈ کے مضمون کے حوالے سے ہم نے نظم داغ کا مطالعہ نہیں کیا۔ البتہ مضمون کا مندرجہ ذیل اقتباس نظم مرزا غالب کے آخری بند میں کس حد تک پرتو افگن ہے آپ تقابل کرکے دیکھ سکتے ہیں۔ آرنلڈ نے ورڈزورتھ کی عظمت اور اولیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"On the whole, then, as I said at the beginning, not only is Wordsworth eminent by reason of the goodness of his best work, but he is eminent also by reason of the great body of good work which he has left to us. With the ancients I will not compare him.In many respects the ancients are far above us, and yet there is something that we demand which they can never give. Leaving the ancients let us come to the poets and poetry of Christendom. Dante, Shakespeare, Moliere, Milton, Goethe are altogether larger andmore splendid luminaries in the poetical heaven than Wordsworth. But I know not where else, among the moderns, we are to find his superiors.

He is one of the very chief glories of English Poetry ; and by nothing is England so glorious as by her poetry. Let us lay aside every weight which hinders our getting him recognised as this, and let our one study be to bring to pass, as widely as possible and as truly as possible, his own word concerning his poems: "They will co-operate with the benign tendencies in human nature and society, and will, in their degree, be efficacious in making men wiser, better, and happier[45]".

ان سطور کے ساتھ مرزا غالب کا آخری بند رکھ کر دیکھیے جو مندرجہ ذیل اشعار پر مبنی ہے :

اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے ؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے ؟

زیر نظر بحث کا ایک اہم گوشہ ابھی تشنۂ تکمیل ہے . اقبال نے اپنی نظم مرزا غالب میں غنچۂ دلی اور گل شیراز کے جو استعارے قائم کیے ہیں ان سے کون شخصیات مراد ہیں . گذشتہ صفحات میں ان کا تعین ہو جاتا ہے مگر اس ضمن کے بعض حوالوں کی مزید تنقیح و تنقید کی ضرورت ہے ۔ خصوصاً ان استعاروں کی تشریح اور وضاحت کو معروف شارحین کے ارشادات کے باوجود اطمینان بخش قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ آئندہ صفحات میں اختصار کے ساتھ وضاحت طلب نکات پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے ۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے زیر بحث استعاروں کی بابت مشورہ کے دوران میں ، پروفیسر جابر علی سید مرحوم کے ایک مختصر مضمون "اقبال کے ایک مصرع کی تشریح" کی جانب توجہ دلائی ۔ یہاں اس مضمون پر بوجوہ استدراک ضروری ہے ۔ اس مضمون سے یہ بھی کھلا کہ وہ ہمارے زیر نظر مقالہ میں

پروفیسر صابر کاوروی اور ڈاکٹر شفیق احمد کی منقول توجیہات کا ماخذ ہے۔ علاوہ ازیں خود جابر علی سید مرحوم کی تشریح سے ہمیں اختلاف ہے اور ان کے بیان میں بعض مقامات محل نظر ہیں۔ اقبالیات کے قارئین کے افادہ کے لیے ان کی وضاحت ضروری ہے۔ سید مرحوم، علامہ اقبال کی نظم مرزا غالب کا ہند نمبر تین نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> "بانگِ درا" کی شرح میں یوسف سلیم چشتی صاحب نے "گل شیراز" سے مراد خواجہ حافظ شیرازی لی ہے اور مولانا غلام رسول مہر کی شرح میں اس سے مراد سعدی شیرازی ہیں۔ عابد علی عابد صاحب کے خیال میں گل شیراز عرفی شیرازی کے لیے استعمال ہوا ہے اس طرح گل شیراز کی تین مختلف تعبیریں پیش کی گئی ہیں اور تینوں غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ استعارہ پسند اقبال نے "غنچۂ دلی" اور "گل شیراز"، میں دو بالکل نئے اور خیال انگیز استعارے قائم کیے ہیں۔

۱۔ "غنچۂ دلی" سے مراد غالب لینا اضحوکہ ہے۔ اس میں تحقیر کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ غالب کو غنچہ دلی قرار دینے کے لیے مرزا سودا جیسے ہجو گو کی ضرورت تھی ورنہ کوئی امکان اس بات کا نظر نہیں آتا کہ ایک ممدوح اور آئیڈیل شاعر کے لیے اقبال، ایسی مضحکہ خیز اور دو رازکار تعبیر لائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ غنچہ دلی، استعارہ ہے اردو زبان کے لیے جو غالب کی جنس کی "فلاورنگ" سے پہلے ایک نو دمیدہ، نامکمل اور ترقی یافتہ زبان تھی۔۔۔"

۲۔ "گل شیراز" استعارہ ہے فارسی زبان کی طرف اس کے وسیع اور صدیوں تک پھیلے ہوئے شعری، نثری اور لسانی سرمائے کی بنا پر، غالب کے زمانے تک فارسی زبان کی عمر کم از کم نو سو سال تھی ہے اس طویل عرصہ میں فارسی شاعری ایک حد تک بین الاقوامی زبان بن چکی تھی۔

اقبال کے لیے فارسی جیسی مکمل اور عظیم زبان کو اس کے اصناف کی بوقلمونی اور تخیلات کی رنگا رنگی کے پیش نظر گل شیراز کہنا بالکل جائز اور

صحیح تھا اور اقبال نے ایسا ہی کیا ہے۔ اقبال کا ذہن کس بنا پر قبول کر لیتا کہ غالب کے مقابلے میں حافظ، سعدی یا عرفی کسی قسم کی شعری اور شخصیاتی فروتری رکھتے ہیں۔۔۔ غرض شیراز کے تین بڑے شاعروں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کو غالب سے متصادم کرا لیا جاتا اور غالب کو ان سے اڑا بتایا جاتا"۔

جابر علی سید مرحوم نے غالب کے شعر:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

کے حوالے سے تقریباً دو صفحے تحریر کیے ہیں ان کے "مطابق یہی وہ شعر ہے جو مرزا غالب لکھتے وقت اقبال کے نیم شعور میں کام کر رہا تھا اور موزوں وقت دیکھ کر ابھر آیا۔

اقبال کا مصرع ہے:

ع خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر

غالب نے اپنے ریختے کو رشک فارسی کہا ہے۔ خیالات، مضامین، معانی حیات آفرینی، لفظ فہمی، ترکیب تراشی کی غیر معمولی صلاحیت کے اظہار کی بنا پر۔ اقبال نے اسی صلاحیت کی فراوانی کے لیے خندہ زنی کے رویے کا ذکر کیا ہے اور مزید یہ کہ اس کو دو یعنی اور نئے استعاروں میں چھپا کر رکھ دیا ہے اگر ہم اقبال کے مصرع کو غالب کے شعر کی شرح منظوم بھی کہہ دیں تو غلط بات نہ ہوگی۔۔۔ اقبال کے ذہن میں کبھی اردو اور فارسی کے شعراء کے موازنے کا خیال نہیں آیا۔ وہ عملی نقاد نہ تھے لہ لکھنے والے نقاد، البتہ نظریاتی نقاد ضرور تھے۔ لیکن وہ بھی بیشتر اشعار میں اور کم تر نجی خطوط میں۔ ان سے یہ توقع کرنا غلط ہوگا کہ اپنے ہیرو کو ایران کے عظیم شعراء کے مقابلے پر لاتے لیکن مجموعی طور پر انھوں نے اپنے زیر نظر مصرع میں ایسا ہی کیا ہے لیکن غیر معمولی احتیاط برتتے ہوئے خود غالب کے ایک معنی خیز شعر کو پس منظر میں رکھتے ہوئے ایسا کیا ہے اور میں نے اس پس منظر کو زیادہ وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے"[۶۶]۔

اب ہم جابر صاحب کی تشریح کے متذکرہ التباسات کا جائزہ لیتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یوسف سلیم چشتی نے حل لغات میں گل شیراز سے حافظ اور سعدی کی شاعری مراد لیا ہے البتہ تشریح میں صرف حافظ کا نام لیا ہے۔ دوسرے غلام رسول مہر کے مطابق ''گل شیراز'' سے اشارہ حافظ شیرازی کی طرف ہے اور یہ بھی درست نہیں کہ عابد علی عابد کے خیال میں گل شیراز سے مراد عرفی شیرازی ہے۔ عابد علی عابد نے تلمیحات اقبال میں گل شیراز کی وضاحت میں عرفی شیرازی کا ذکر ہی نہیں کیا ہے — اور یہ بھی معلوم نہیں ہو پاتا کہ جابر صاحب کس بنیاد پر غنچۂ دلی سے غالب مراد لینا، مضحکہ خیز اور تحقیر آمیز خیال کرتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جابر صاحب کے نزدیک مرزا سودا محض ہجو گو تھے اور یہ حیثیت غزل گو اس کی فنی شخصیت کسی مرتبہ و مقام کی حامل نہیں تھی۔ علاوہ ازیں مضمون نگار نے بغیر کسی جواز اور قرینہ کی نشاندہی کے، غنچہ دلی کو اردو زبان اور گل شیراز کو فارسی زبان کا استعارہ قرار دے دیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دور از کار توجیہہ ہے اس لیے یہاں اس پر زیادہ تبصرہ نہیں کیا جا رہا۔

زیر تبصرہ مضمون کے آخر میں کہا گیا ہے کہ:

> ''ان (اقبال) سے یہ توقع کرنا غلط ہوگا کہ اپنے ہیرو کو ایران کے عظیم شعرا کے مقابلے پر لاتے''۔

اس سلسلے میں کسی مدلل صراحت کی ضرورت ہوں نہیں کہ کوئی ہیرو اگر اپنے مداح کا بلا مقابلہ ممدوح اور محبوب نہیں تو وہ ہیرو کا مرتبہ نہیں پا سکتا۔ کسی فرد یا شخصیت کو ہیرو تسلیم کرنے کا لازمی مطلب دوسری مقابل شخصیات کے محاسن کا انکار نہیں البتہ اپنے ہیرو کی محبوبیت کا بدرجہ غایت اثبات و اقرار ضرور ہے اور پھر جابر علی سید سے بہتر کون جانتا ہوگا کہ منطقی استدلال اور شاعرانہ استدلال کا کیا مطلب ہے اور ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ — بہرحال ایک اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ میتھیو آرنلڈ نے ورڈزورتھ کے تعارف اور اس کی عظمت کے بیان میں جو کردار ادا کیا ہے کچھ ویسا ہی فرض اقبال نے عظمت غالب کا احساس دلانے کے لیے ادا کیا ہے۔ آرنلڈ نے دوسرے عظیم شعرا کے مقابلے پر ورڈزورتھ کے کمال فن کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"Wordsworth has been in his grave for some thirty years,

and certainly his lovers and admirers cannot flatter themselves that this great and steady light of glory as yet shines over him. He is not fully recognised at home; he is not recognised at all abroad. Yet I firmly believe that the poetical performance of Wordsworth is, after that of Shakespeare and Milton, of which all the world now recognises the worth, undoubtedly the most considerable in our language from the Elizabethan age to the present time. Chaucer is anterior; and on other grounds, too. he cannot well be brought into the comparison. But taking the roll of our chief poetical names, besides Shakespeare and Milton, from the age of Elizabeth downwards, and going through it,—Spenser, Dryden, Pope, Gray, Goldsmith, Cowper, Burns, Coleridge, Scott, Campbell, Moore, Byron, Shelley, Keats (I mention those only who are dead), —I think it cartain that Wordsworth's name deserves to stand, and will finally stand, above them all. Several of the poets named have gifts and excellences which Worhsworth has not, But taking the performance of each as a whole, I say that Words worth seems to me to have left a body of poetical work superior in power, in interst, in the qualities which give enduring freshness, to that which any one or the others has left.

But this is not enough to say. I think it certain, further, that if we take the chief poetical names of the Continent since the death of Moliere, and, omitting Goethe, confront the remaining names with that of Wordsworth, the result is the same[47]."

بارے یہ اختلافات برسبیل تذکرہ ہیں ۔ ورنہ اصل بحث کا مدار اقبال کے دو استعاروں کی تفہیم پر ہے ۔ اس بحث میں الجھن کا باعث یہ ہے کہ سب شارحین مع جابر علی سید نے غنچہ دلی اور گل شیراز کے استعارے کی شناخت پر ساری توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اپنا سارا زور صرف کر دیا ۔ اگر مستعار الیہ کے تعین اور وجہ استعارہ پر رکنے کی بجائے ان استعاروں کی بنیاد پر غور کیا

جاتا اور اقبال کی استعاراتی دلالتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی تو شاید اس مصرعہ کا نہ صرف مفہوم واضح ہو جاتا بلکہ شاعر کا اصل مدعا معلوم کرنے میں بھی کسی قسم کی دشواری پیش نہ آتی ۔ ہم جہاں تک ان استعاروں کو سمجھ سکے ہیں ، اس کے مطابق اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک مخاطب کے کلام کی محدود مقبولیت اور کلام غالب کی محدود تحسین کا پہلو اقبال کے پیش نظر ہے ۔ غنچہ ایک منہ بند کلی ہوتا ہے لہٰذا اس کی خوشبو کلی میں قید رہتی ہے اس کے مقابلے میں پھول کی خوشبو نکل کر اطراف کو معطر کر چکی ہوتی ہے قیاس یہ چاہتا ہے کہ اقبال کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ غالب کی شہرت ابھی (۱۹۰۱ء تک) عام نہیں ہوئی ۔ تاریخی حقیقت بھی یہ ہے کہ غالب کی تمام تر ناموری کے باوجود ۱۹۰۱ء تک غالب کے احوال و آثار اور تحسین و تشریح پر مبنی جو کتابیں چھپی تھیں ان کی کیفیت یہ ہے :

۱ ۔ غالب کی سب سے پہلی شرح " وثوق صراحت" ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی[۴۸]۔

۲ ۔ شرح حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی کے نام سے ۱۸۹۹ء میں چھپی[۴۹]۔

۳ ۔ پہلی مقتدر کتاب جس کے ایک حصہ میں مرزا کے کلام سے ناقدانہ الداز میں بحث کی گئی ہے "آب حیات" ہے جو ۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی[۵۰] ۔

۴ ۔ حالی کی یادگار غالب ۱۸۹۷ء میں طبع ہوئی[۵۱]۔

اس کے بعد بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں علی الترتیب صلاح الدین خدا بخش کا غالب پر انگریزی مضمون ۱۹۱۲ء[۵۲] میں شائع ہوا اور عبدالرحمٰن بجنوری کے محاسن کلام غالب کا سال اشاعت ۱۹۲۱ء[۵۳] ہے ۔ اس کے مقابلے میں گل شیراز گویا حافظ کو عالمگیر شہرت نصیب ہو چکی تھی ۔ اس صورت حال کے پیش نظر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص ۱۹۰۳ء میں امیر مینائی کے حالات و سوانح کی عدم اشاعت کو اندھیر قرار دے اور یہ کہے "اگر یہی شخص یورپ یا امریکہ میں ہوتا تو اس کی زندگی میں ہی اس کی کئی سوانح عمریاں نکل جاتیں مگر افسوس ہے ہندوستان میں ان کی زندگی میں تو درکنار ، ان کی وفات کے بعد بھی ان کی کوئی لائف نہ لکھی

گئی"... وہ مرزا غالب پر اوپر درج چار کتابیں دیکھ کر کیوں رنجیدہ و ملول نہ ہوتا ہوگا۔ اس تناظر میں خلیفہ عبدالحکیم کی اطلاع کہ "ایک زمانے میں اقبال غالب پر کتاب لکھنا چاہتے تھے" کس قدر صداقت اور اہمیت کی حامل ہے، قیاس کیا جا سکتا ہے۔ راقم کو غنچہ دلی کے استعارے سے غالب کے لفظی اور معنوی اشکال کی طرف بھی اشارہ نظر آتا ہے۔ اگر ایک طرف مرزا غالب خود اپنے اشعار کے الفاظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم خیال کرتے تھے تو دوسری طرف عام پبلک کو بھی غالب کی مشکل پسندی سے شکایت تھی۔ اس وقت تک لوگوں پر کلام غالب کے "اسرار معانی" اس حد تک منکشف نہیں ہوئے تھے جس قدر مطالعہ غالب کی تحریک نے آج فراہم کر دیے ہیں۔ جب کہ حافظ کا کلام مکتب و مسجد میں صوفی و ملا، محل اور درگاہ میں شاہ و گدا اور گلی کوچوں میں پیر وجواں کے لب پر رواں تھا بلکہ دیوان حافظ روزمرہ میں یوں داخل تھا کہ ہر کام کے لیے اس سے فال نکالی تھی۔ اس حوالے سے غالب کو غنچہ دلی اور حافظ کو گل شیراز قرار دینا اقبال کی خلاق اور بلاغت کا کمال ہے اور اسی مناسبت سے غنچہ دلی کی خندہ زنی کی معنویت ابھرتی ہے گویا اقبال کے نزدیک جیسے ہی کلام غالب کے مطالب و معانی آشکار ہوں گے تو کلام حافظ جو شرح و تفسیر کا محتاج نہیں تھا کلام غالب کے سامنے ماند پڑ جائے گا۔ بالفاظ دیگر اقبال کے خیال میں غالب اس لیے غنچہ دلی (چھوٹا شاعر) کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کا کلام ابھی شرح صدر گویا کل کی حیثیت پر پہنچنے کا منتظر ہے۔ بقول اقبال غالب وہ شاعر ہے جس کے لب اعجاز پر نطق کو سو ناز ہیں اور جس کے انداز پر شاید مضمون تصدق ہے۔ کیا عظیم شاعری کی یہی دو تین بنیادی خصوصیات نہیں ہوتیں؟... اور عظیم شاعری کے ایک بڑے حصہ کا اڑا وصف یہ بھی ہے کہ اس کا ابلاغ مختلف زمانوں کے خوش ذوق سخن شناسوں کے تعارف، تعلیم، تحسین اور تفہیم کی متواتر اور مسلسل کوششوں کا مرہون منت ہوتا ہے — کیا یہ واقعہ نہیں کہ ستمبر ۱۹۰۱ء تک غالب کے تعارف اور استحسان پر محیط صرف ایک کتاب—اور وہ بھی اس حالی کی یادگار غالب ہی تھی۔

آرنلڈ کی محولہ نظم یعنی سیموریل ورسز کی مطالعہ اقبالیات میں بے حد اہمیت ہے۔ اقبال کی علمی اور ذہنی زندگی میں یہ نظم ایک ایسی مثال کی حیثیت رکھتی ہے جو نوعیت کے اعتبار سے دنیائے ادب میں عمومیت کی حامل ہے مگر اقبال کے تخلیقی عمل کے مطالعہ کے حوالے سے خصوصیت اختیار کر

گئی ہے ۔ تقریباً ادب کے ہر قاری کا یہ تجربہ ہے کہ اس کے مطالعہ ادب کے ابتدائی برسوں میں ایک دو نثری تحریریں، ایک دو نظمیں یا تین چار متفرق اشعار اس کے دل و دماغ پر اتنا گہرا نقش اور اثر چھوڑ جاتے ہیں کہ عمر بھر کسی نہ کسی بہانے یا موقع و محل پر ان کی باز آفرینی ہوتی رہتی ہے یا یوں کہیے کہ یادوں کے گنبد میں ان کی گونج رہتی ہے ——— معلوم ہوتا ہے اقبال کی نفسیات میں میموریل ورسز کچھ ایسے ہی اثرات کی حامل ہے ۔ ہم نے زیر نظر مقالہ میں دیکھا کہ آرنلڈ کی نظم ۱۹۰۱ء میں مرزا غالب پر اقبال کی نظم کا تخلیقی محرک ثابت ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں داغ پر مرثیہ کی تخلیق میں یہ نظم کار فرما ہوئی اور آخر ۱۹۱۵ء میں اقبال کی شخصی واردات پر مبنی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" بھی آرنلڈ کے میموریل ورسز کا تاثر محسوس ہوتا ہے ۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" تیرہ بندوں کے ۸۶ شعروں پر مشتمل نظم ہے جو ان دعائیہ شعروں پر ختم ہوتی ہے :

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اب ان شعروں کے ساتھ آرنلڈ کا آخری بند ملاحظہ کیجیے :

Keep fresh the grass upon his grave
O Rotha, with thy living wave !
Sing him thy best ! for few or none
Hears thy voice right, now he is gone.

یاد رہے : روتھا (Rotha) ورڈ زورتھ کے مدفن کے قریب بہنے والے دریا کا نام ہے" ۔

حواشی

۱ ۔ اقبال نامہ (حصہ اول) ؛ مرتبہ شیخ عطا اللہ ، شیخ محمد اشرف تاجر کتب، لاہور ۔ س ن ، ص ۳ — ۴ ۔

۲ ۔ مطالعہ اقبال : مرتبہ گوہر نوشاہی ، بزم اقبال ، لاہور ، جون ۱۹۷۱ء ، ص ۲۳ ۔

۳ ۔ اقبال نامہ ، حصہ اول ، ص ۲۱ ۔

۴ ۔ بحوالہ ، محمد عبداللہ قریشی ، معاصرین اقبال کی نظر میں ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، نومبر ۱۹۷۷ء ، ص ۲۴ ۔

۵ ۔ ایضاً ، ص ۲۵ ۔

۶ ۔ باقیات اقبال ۔ آئینہ ادب لاہور ، ۱۹۷۸ ، ص ۳۸۶ ۔

۷ ۔ ایضاً ۔ ص ۳۹۶ ۔

۸ ۔ غلام رسول مہر ، مطالب بانگ درا ، لاہور ، س ن ، ص ۸۷ ۔

۹ ۔ باقیات اقبال ۔ ص ۳۳۶ ۔

۱۰ ۔ محمد عبداللہ قریشی ، محولہ بالا ، ص ۲۴ ۔

۱۱ ۔ سر عبدالقادر بحوالہ ۔

(ا) اقبال جادو گر ہندی نژاد از عتیق صدیقی ۔

(ب) اورینٹل کالج میگزین ، لاہور مرتبہ : ڈاکٹر وحید قریشی ۔

(ج) اقبال پر تحقیقی مقالے شائع کردہ بزم اقبال ، لاہور ، ۔

12. Asloob Ahmad Ansari, ed. Iqbal, Essays and Studies, p. 275.

۱۳ ۔ ایضاً ۔

14. Thomas, Carlyle. Heroes and Hero-Worship. Collins Clear Type Press London and Glasgow. N.D. p. 203 -4.

۱۵ ۔ درانی ، سعید اختر ، ڈاکٹر اقبال یورپ میں ، اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور ۔ ص ۱۳۵ ، ۱۳۸

16. Dr. Javed Iqbal, ed., Stray Reflection.

۱۷ - شذرات فکر اقبال (مترجم ڈاکٹر افتخار صدیقی) -

۱۸ - کلیات اقبال (اردو) ، ص - ۲۶

19 (a) The New Encyclopaedia Americana, Grolier Incorporated U.S.A 1982, v. 24, p. 350.

19 (b) The New Encyclopaedia Britannica v. 10 (Micropaedia) Chicago 1985, p. 516.

۲۰ - یوسف سلیم چشتی ، شرح بانگ درا ، عشرت پبلشنگ ہاؤس ، لاہور ، ص ۴۹ -

۲۱ - ایضاً ، ص ۵۱ -

۲۲ - رازی ، شرح بانگ درا، ناشر فرمان علی ، لاہور ، س ن - ، ص ۱۹-۲۰ -

۲۳ - ڈاکٹر محمد باقر ، شرح بانگ درا ، تاج بک ڈپو ، لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۱۶ -

۲۴ - غلام رسول مہر ، مطالب بانگ درا ، ص ۹ -

۲۵ - ڈاکٹر صدیق جاوید ، اقبال پر تحقیقی مقالے ، بزم اقبال، لاہور ۱۹۸۸ء -

۲۶ - ایضاً ، ص ۵۰ -

۲۶ - (الف) مطالب بانگ درا ، ص ۱۴۷ -

۲۶ - (ب) عابد علی عابد ، تلمیحات اقبال ، بزم اقبال لاہور ، ۱۹۵۹ء ص ۶۶ -

۲۷ - اقبال ، مترجمہ : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ، شذرات فکر اقبال ، ص ۱۰۲ -

۲۸ - ایضاً ، ص ۱۰۵ -

۲۸ - پروفیسر جابر علی سید ، اقبال کا فن ارتقا - بزم اقبال لاہور ۱۹۷۸ء ، ص ۶۳ ، لاہور -

۲۹ - دیکھیے کتاب از ڈاکٹر یوسف حسین ، حافظ اور اقبال -
اس موضوع پر اس کے علاوہ بھی کئی مقالات اور مضامین شائع ہو چکے ہیں -

۳۰ - اقبال از عطیہ فیضی ترجمہ ضیا الدین احمد برنی ، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۵۶ء ، ص ۷۸ -

۳۱ - ایضاً ، ص ۸۱ -

۳۲ - عبدالواحد معینی (مرتب) مقالات اقبال ، شیخ محمد اشرف تاجر کتب، لاہور مئی ۱۹۶۳ء ، ص ۱۶۶—۱۶۷ -
یا دیکھیے : پروفیسر حق نواز (مرتب) اقبال اور اذت پیکار -

۳۳ - پیام مشرق - (دیباچہ)

۳۴ - مقالات اقبال بحوالہ بالا ، ص ۱۶۷ -

35. Chambers's Cyclopaedia Of English Literature, Edited by David Patrick. Revised and Expanded by J. Liddell Geddie and J.C. Smith. v. III, First Published 1901, Revised and Expanded, 1938.

۳۶ - ڈاکٹر محمد شفیق احمد ، شرح بانگ درا مع تحقیق متن ، مکتبہ علم و فن اردو بازار ، لاہور ، ۱۹۸۸ء ، ص ۱۳ -

۳۷ - ایضاً ، ص ۱۲ -

38. Journal of the Research Society of Pakistan Lahore, Oct. 1977,

۳۹ - پروفیسر جابر علی سید ، اقبال کا فنی ارتقا ، بزم اقبال لاہور ، جولائی ۱۹۷۸ء ، ص ۶۳ -

۳۹ - (الف) ڈاکٹر اکبر حسین قریشی ، مطالعۂ تلمیحات و اشارات اقبال ، اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور ، ۱۹۸۶ء ، ص ۳۰ — ۵۲۹ -

40. Wordsworth Poetical Works. edited by Thomas Hutchison. Oxford University Press. 1969. p. xxix.

41. The Norton Anthology of English Liter ature, ed. M.H.Abrams, General Edition New York 1962, p. 1611.

42. Mathew Arnold. Essays In Criticism. edited by S.R. Littlewood. Macmillan and Co. Ltd. London, 1954. p. 73

43. Abrams op. cit. p. 1161.

44. Chamber's Cyclopaedia op. cit. p. 595.

45. Mathew Arnold, op. cit p. 95-96.

۴۶ - جابر علی سید : تنقید اور ہرلزم ، کاروان ادب ملتان ، صدر ۱۹۸۲ء ، ص ۷۴ - ۷۸ -

47. Mathew Arnold. op. cit p. 78-79.
S. R. Littlewood. Macmillan and Co. Ltd, London 1954.

۴۸-۴۹ - عیار غالب ، مالک رام ، دہلی ۱۹۶۹ء ، ص ۲۶۵ .

۵۰-۵۲ - دیباچہ تنقید غالب کے سو سال ، سید فیاض محمود ، مطبوعات یادگار غالب ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۱۹۶۹ء ، ص ۱۸ — ۱۹ .

54. Abrams. op. cit. p. 1613.

پروفیسر ڈاکٹر صدیق شبلی*

علامہ اقبال کی ایک نادر تحریر

علامہ اقبال کی جس نادر تحریر کا اس مضمون کے ذریعے تعارف کرایا جا رہا ہے وہ ان کی ایک درخواست ہے جو انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹری نیٹی کالج میں داخلے کے لیے وہاں کے سینئر ٹیوٹر کے نام لکھی ۔ اگرچہ قطعی شواہد موجود نہیں جن کی روشنی میں اس تحریر کو نادر قرار دیا جا سکے پھر بھی یہ تحریر علامہ اقبال کی مختلف تحریروں کے اب تک شائع ہونے والے کسی مجموعے میں شامل نہیں ۔ اگر یہ اس سے پہلے کہیں شائع ہو بھی چکی ہے تو اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی کیونکہ اس درخواست میں ایک دو توجہ طلب باتیں ضرور ہیں جن کا ذکر علامہ کی کسی سوانح عمری یا ان پر لکھے گئے کسی مضمون میں نہیں ملتا ۔

علامہ اقبال ستمبر ۱۹۰۵ء سے لے کر جولائی ۱۹۰۸ء تک اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں یورپ میں قیام پذیر رہے ۔ ان کے اس قیام کے بارے میں ساری معلومات کا ریکارڈ ابھی تک جمع نہیں کیا جا سکا ۔ اس ضمن میں علامہ کے ایک ارادت مند ڈاکٹر سعید اختر درانی صاحب' کی کاوشیں قابل داد ہیں ۔ ڈاکٹر درانی نے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیتوں کے باوجود کیمبرج اور سوئٹزرلینڈ کی لائبریریوں اور ریکارڈ خانوں سے اقبال کے بارے میں بے حد مفید اور قیمتی معلومات کا سراغ لگایا ہے جن سے حیات اقبال کے کئی گوشے جو اس سے پہلے تاریکی میں تھے ، روشن ہو گئے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''اقبال کے' قیام یورپ کے دوران ان کی تعلیمی سرگرمیوں

---

* شعبۂ اردو ، علامہ اقبال فاصلاتی یونیورسٹی ، اسلام آباد ۔

کے بارے میں تاریخوں کا تعین قدرے مشکل ہے"۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ علامہ سے متعلق یورپ میں موجود ریکارڈ حاصل کرنے کے لیے کسی باضابطہ منصوبے کے تحت کام نہیں کیا گیا ۔ علامہ کی زیر تبصرہ تحریر بھی اتفاق ہی سے مل گئی ہے ۔

علامہ کی یہ درخواست فل سکیپ سائز کے کاغذ پر لکھی گئی ہے ۔ یہ درخواست اوپر سے نیچے کی طرف نہیں آئی بلکہ لمبائی کے رخ کاغذ کو تین متوازی کالموں میں تقسیم کر کے لکھی گئی ہے ۔کاغذ سادہ ہے لکیردار نہیں ۔ درخواست لکھنے میں کوئی خاص اہتمام روا نہیں رکھا گیا ۔ کئی جگہ لفظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں پھر بھی ہاتھ سے لکھی ہوئی اس تحریر کو پڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ۔ علامہ کی یہ درخواست کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کے ریکارڈ آفس میں موجود ہے اور راقم کو اس کی نقل معاون ریکارڈ کیپر ڈاکٹر مس ای ۔ ایس ۔ ایل گرین کی مہربانی سے میسر آئی ۔

اس درخواست کی اولین اہمیت تو یہی ہے کہ علامہ اقبال کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے ۔ حق شناسی کا تقاضا ہے کہ ہم ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک ایک سطر کو محفوظ کر لیں ۔ ہماری یہ کاوش جہاں ہماری ارادت کا ثبوت فراہم کرے گی وہیں اس سرمائے سے ہمیں اور بھی بہت کچھ حاصل ہوگا ۔ زیر نظر درخواست سے بھی ہمیں اقبال کے بارے میں بعض نئی لیکن مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں ۔ ٹرنٹی کالج میں داخلے کے لیے یہ درخواست علامہ نے ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء کو تحریر کی اور اس پر انھوں نے اپنا پتا لندن ہی کا لکھا ۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال "اقبال" ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء کو لندن پہنچے اور ایک رات شیخ عبدالقادر کے ساتھ گزارنے کے بعد ۲۵ ستمبر کو کیمبرج روانہ ہو گئے[۳]"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب علامہ کی اپنی ایک تحریر دستیاب ہو گئی ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ ۲۹ ستمبر تک علامہ لندن ہی میں مقیم رہے ۔ وہیں سے انھوں نے اپنی درخواست کیمبرج بھجوائی اور اس پر لندن ہی کا پتا تحریر کیا ۔ اگر وہ لندن میں مقیم نہ ہوتے تو یہ پتا تحریر نہ کرتے ۔ علامہ اقبال انگلستان میں جہاں جہاں قیام پذیر رہے ، ان میں سے بیشتر مقامات کا پتا چلایا جا چکا ہے ۔ لیکن اس درخواست میں لندن کا جو ایڈریس دیا گیا ہے اس کی نشاندہی اب تک کسی نے نہیں کی ۔ اس تحریر سے لندن میں علامہ کی ایک اور جائے قیام کا پتا ملا ہے خواہ یہ قیام کتنا ہی مختصر سہی لیکن اس مقام کو

علامہ کی میزبانی کا شرف تو حاصل رہا ہے۔ سوئٹزر لینڈ کے شہر لوکارنو کی ایک گلی میں گوئٹے کی ایک یادگار قائم کی گئی ہے کیونکہ اس گلی کے ایک مکان میں گوئٹے نے ایک رات قیام کیا تھا۔ پیرس شہر کی سڑکیں اور گلیاں مشاہیر کے ناموں کی یادگاری تختیوں سے بھری پڑی ہیں۔ ۹۴ شیپ بریڈیش روڈ پر علامہ کے نام کی تختی لگے یا نہ لگے یہ جگہ اہل پاکستان کے لیے اہمیت کی حامل ضرور ہو گئی ہے۔

یہ درخواست ٹری نیٹی کالج، کیمبرج یونیورسٹی کے سینئر ٹیوٹر کے نام لکھی گئی ہے اس میں اقبال نے عربی و فارسی اور مغربی فلسفے کے بارے میں اپنے علم کی بنا پر ریسرچ سٹوڈنٹ کی حیثیت سے داخلہ لینے کی خواہش کا اظہار کیا ہے اور پہلی بار اپنے موضوع تحقیق کا بھی ذکر کیا ہے۔ اقبال نے جو مقالہ کیمبرج یونیورسٹی کے لیے لکھا اور جس پر بعد میں انھیں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی ملی اس کا عنوان (The Development of Metaphysics in Persia) ہے۔ یعنی ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا لیکن اس درخواست میں علامہ نے اپنے موضوع کو ان لفظوں میں لکھا ہے:

The Genesis & Development of Metaphysical Concepts in Persia یعنی ایران میں مابعد الطبیعاتی تصورات کا آغاز و ارتقاء ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعد میں شاید اپنے اساتذہ کے مشورے پر اس عنوان کو مختصر کر کے انھوں نے The Development of Metaphysics in Persia کر لیا۔ اس درخواست کی بدولت یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آئی کہ علامہ اپنا تحقیقی مقالہ پہلے کس عنوان سے لکھنا چاہتے تھے اور انھوں نے اسے کیسے سوچا تھا۔ مقالے کے بارے میں ان کی سوچ کے نقش اولین کا ان کی اس تحریر سے پتا چلا، کسی اور جگہ اس کا ذکر نہیں ملتا۔

علامہ نے اس تحریر میں بعض دوسرے امور بھی درج کیے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے ایم اے فلسفہ ۱۸۹۹ء میں پاس کیا اور اس سے اگلے سال میکلوڈ عربک ریڈر بنا اور اورینٹل کالج سے منسلک ہوا۔ ایم اے پاس کرنے کا سال تو درست ہے لیکن میکلوڈ عربک ریڈر اور اورینٹل کالج کے سٹاف میں وہ اسی سال شامل ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار[4] کی تحقیق کے مطابق اقبال کا تقرر بطور میکلوڈ عربک ریڈر ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو ہوا گویا

وہ اسی سال میکاوڈ عربک ریڈر بنے جس سال انھوں نے فلسفے میں ایم اے کا امتحان پاس کیا ۔ اس کے علاوہ اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور کی اسسٹنٹ پروفیسری ، عبدالکریم الجیلی پر اپنے ایک مضمون کا بھی ذکر کیا ہے اس درخواست میں بعض نام بھی قابل توجہ ہیں ۔ عبدالکریم الجیلی کو عبدالکریم الجیلانی لکھا ہے ۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور اورئینٹل کالج لاہور کو علی الترتیب لاہور گورنمنٹ کالج اور لاہور اورئینٹل لالج تحریر کیا ہے ۔

درخواست کا عکس ملاحظہ فرمائیں :

درخواست کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے

بخدمت

جناب سینئر ٹیوٹر
ٹری نیٹی کالج کیمبرج

جناب عالی !

میں کیمبرج یونیورسٹی میں ریسرچ سٹوڈنٹ کی حیثیت سے داخلہ لینا چاہتا ہوں میں نے پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے ۱۸۹۹ء میں پاس کیا ۔ اس سے اگلے سال مجھے اس یونیورسٹی کی طرف سے میکاوڈ عربک ریڈر مقرر کیا گیا اور لاہور اورئینٹل کالج کے سٹاف کے ساتھ منسلک کیا گیا اور ۱۹۰۳ء میں میرا تقرر لاہور گورنمنٹ کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ ہوا ۔ اپنے سابقہ مطالعے اور تحصیلات کے اظہار کے لیے میں نے ''نظریہ توحید مطلق — عبدالکریم الجیلانی کی تعریف و تشریح کی روشنی میں'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ۔ جو انڈین انٹی کیوری کی جلد بست و نہم سال ۱۹۰۰ء صفحہ ۲۴۰ تا آخر میں شائع ہوا۔ جس کا ایک نسخہ ایک دو دن میں آپ کو ارسال کیا جائے گا ۔

فارسی و عربی میں اپنے علم اور یورپی فلسفہ (جس کا مطالعہ میں نے اس سے بارہ برس قبل شروع کیا تھا) سے اپنی شناسائی کے پیش نظر مجھے خیال آتا ہے کہ میں اسلامی فلسفہ کے کسی شعبے میں مغرب کے علم میں شاید کوئی اضافہ کر سکوں ۔ اس لیے میں ''ایران میں مابعد الطبیعاتی تصورات کا آغاز و ارتقا'' کو اپنے موضوع تحقیق کے طور پر تجویز کرتا ہوں یا پھر عربی فلسفے سے متعلق کوئی علمی کام جس کی یونیورسٹی منظوری دے ۔

مزید استدعا کرتا ہوں کہ میری عمر اکیس سال ہو چکی ہے مطلوبہ سرٹی فکیٹ درخواست کے ساتھ منسلک ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری درخواست متعلقہ حکام کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

آپ کا فرمانبردار خادم
محمد اقبال ایم اے
۶۹ شپ ہرڈ بش روڈ، لندن

مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء

حواشی

۱۔ درانی سعید اختر، اقبال یورپ میں، لاہور ۱۹۸۵ء مضامین ۳ تا ۱۱۔

۲۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود (حیات اقبال کا تشکیلی دور) لاہور ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۲۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۱۔

۴۔ ذوالفقار، غلام حسین ڈاکٹر، اقبال ایک مطالعہ، لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۔

صابر کاوروی*

علامہ اقبال کی نظم ''موٹر''

بانگِ درا ص ۱۷۸ پر ایک نظم ہے ، جس کا عنوان ''موٹر'' ہے ۔ نظم مختصر ہے اور غیر معروف بھی مگر ایک ہنگامی لمحے کی پیداوار ہونے کے باوجود اس میں مستقل اہمیت کے کچھ عناصر بھی موجود ہیں ۔ نظم میں اقبال مظاہرِ فطرت سے بعض ایسے اصول اخذ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ، جو جادۂ حیات میں بنی نوع انسان کے لیے راہ نما ثابت ہو سکتے ہیں ۔

نظم کے اشعار درجِ ذیل ہیں :

موٹر :

کیسے بتے کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرامِ ناز
مانندِ برق تیز ، مثالِ ہوا خموش

میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر یہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش

ہے پا شکستہ شعلۂ فریاد سے جرس
نکہت کا کارواں ہے مثالِ صبا خموش

---

* شعبۂ اردو ، گورنمنٹ کالج ، بالا کوٹ ۔

مہنا مدام شورش قلقل سے ہا یہ گل
لیکن مزاجِ جام خرام آشنا خموش

شاعر کے فکر کو پرِ پرواز خامشی
سرمایہ دار گرمیِ آواز خامشی

جہاں تک نظم کے زمانۂ تصنیف کا تعلق ہے اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے ۔ نظم کی اولین اشاعت کا علم نہیں ہو سکا۔ زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ نظم بالکِ درا میں اشاعت سے پہلے کہیں اور شائع نہیں ہوئی ۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی اس نظم کا سال تصنیف ۱۹۱۳ء قرار دیتے ہیں[۱] ۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان محلِ نظر ہے ۔ انھوں نے اس دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں دی ۔ نظم کا قدیم ترین متن علامہ کی بیاض ہے ۔ جس میں یہ نظم اقبال کی دو معروف نظموں ''نوید صبح[۲]'' اور ''میں اور تو[۳]'' کے درمیان درج ہے ۔ ''نوید صبح'' اولاً جنوری ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی تھی ۔ نظم ''میں اور تو'' کی اولین اشاعت کا ہمیں علم نہیں ہو سکا ، تاہم بیاض میں درج اس سے اگلی نظم ''شفاخانۂ حجاز''[۴] رسالہ صوفی کے مارچ ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی ۔ رسالہ ''صوفی'' میں اقبال کا بیشتر کلام دوسرے رسائل سے نقل کیا جاتا تھا ۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شفاخانۂ حجاز مارچ ۱۹۱۳ء سے بہت پہلے لکھی گئی ہوگی ۔ ان قرائن سے نظم ''موٹر'' کا زمانۂ تصنیف ۱۹۱۲ء ہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے ۔ اس نظم کے پس منظر کے ضمن میں مستند ترین بیان مرزا جلال الدین بیرسٹر کا ہے ، جنھوں نے نظم کے زمانۂ تصنیف پر تو کوئی روشنی نہیں ڈالی لیکن اس کے محرکات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ''ایک مرتبہ سردوالفقار علی خان ، سر جوگندر سنگھ اور میں اقبال کے ساتھ نواب صاحب کی موٹر میں شالا مار کی طرف سیر کو نکلے ۔ اس زمانے میں موٹر سازی کی صنعت ابھی تکمیل پذیر نہ ہوئی تھی اس لیے موٹریں ، چلنے کے دوران میں ، اچھا خاصا شور پیدا کرتیں ۔ مگر نواب صاحب کی موٹر چونکہ بیش قیمت تھی ، اس لیے اس میں یہ نقص بڑی حد تک غائب تھا ۔ چنانچہ سر جوگندر سنگھ نے

از راہِ حیرت کہا کہ نواب صاحب کی موٹر کس قدر خاموش واقع ہوئی ہے ۔ بظاہر یہ بات کوئی ایسے بتے کی نہ تھی کہ اقبال اس سے یوں متاثر ہو جاتے کہ وہ اس فقرے پر اپنی نظم کی بنیاد رکھ دیتے لیکن بانگِ درا میں "موٹر" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کا مطالعہ فرمائیے اور اقبال کی فلسفہ طراز طبیعت کا انداز لگائیے"۔

مرزا جلال الدین بیرسٹر نے نواب صاحب کی جس گاڑی کا ذکر کیا ہے اس ماڈل کا نام Tolbot تھا[۶] ۔ مرزا صاحب سے اس واقعہ کے بیان میں ایک تسامح ضرور ہوا ہے ۔ گاڑی میں سر جوگندر سنگھ نہیں بیٹھے ہوئے تھے ۔ بلکہ ان کے صاحبزادے جت اندر سنگھ تھے ۔ جت اندر سنگھ کی گفتگو کو اقبال نے اس لیے "بتے کی بات" کہا ہے کہ اس سے اقبال کو ایک نکتہ سوجھا اور یہی نظم کا مرکزی خیال بنا ۔

اس امر کی تصدیق اقبال کی قلمی بیاض سے بھی ہوتی ہے ۔ نظم کا اولین متن بخط اقبال اس میں موجود ہے ، جس میں "جوگندر" کے بجائے "جت اندر" لکھا ہے[۷] ۔ چودھری محمد حسین کی ڈائری سے نہ صرف اس کی تائید ہوتی ہے بلکہ بانگِ درا میں اس غلطی کے راہ پا جانے کے متعلق بھی دلچسپ انکشافات ہوتے ہیں ۔ چودھری صاحب ۲۵ فروری ۱۹۲۴ء کی ڈائری میں بانگ درا کی تدوین کے ضمن میں لکھتے ہیں :

"ہاں یاد آ گیا ۔ نظم "موٹر" کے سب سے پہلے مصرع میں جو سردار جوگندر سنگھ کا نام آیا تھا ، تو حقیقت میں یہ غلط ہے ۔ اصل میں مصرع یوں تھا :

ع کوئی بتے کی بات جت اندر نے کل کہی

اور بات کہنے والا اصل میں تھا بھی جت اندر سنگھ ہی ، یعنی سردار جوگندر سنگھ کا بڑا صاحبزادہ ۔ غلطی سے جگندر لکھا جا چکا تھا ۔ پہلی Reading یعنی پہلی نظرثانی کے وقت میں نے نظم پڑھی تو کہا کہ جگندر نہیں ان کا لڑکا جت اندر تھا ۔ جس نے یہ بات کہی اس کا نام لکھو ۔ میں مصر ہوا کہ لڑکا لڑکا ہے اور یہ شعر ہے ، تاریخ نہیں ۔ ذوالفقار علی خان صاحب کے نام کے ساتھ لڑکے کے والد کا نام آ جائے تو اچھا ہے کہ دونوں صاحب آپ کے دوست ہیں۔ ان کے نام

باقی رہیں گے۔ جت الدر کو شاید لوگ سمجھیں بھی نہ کہ کون تھا۔ فرمایا : ٹھیک ہے، مگر یہ پہلا شعر ہی کیوں نہ اڑا دیا جائے ذاتی اور شخصی Reference کی کیا ضرورت ہے شعر بدل دو ۔ اگلے شعر پڑھے تو بدلنے میں دقت معلوم ہوئی فرمایا : چلو رہنے دو ۔ ہمارے دوست ہیں ان کے نام بیچ میں آ جائیں تو کیا حرج ہے ۔ لوگوں کو واہ رہیں گے[۸]"۔

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کے خیال میں نظم کا پہلا شعر موٹر ہی میں کہا گیا[۹] اور باقی اشعار سر ذوالفقار علی خان کی کوٹھی پر لکھے گئے ۔ لیکن نظم کے پہلے شعر میں لفظ " کل " اس دعوے کی تردید کرتا ہے ۔ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم اصل واقعے کے ایک دن بعد کہی گئی ۔ زیر حوالہ نظم میں دو شخصی حوالے ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے نواب سر ذوالفقار علی خان اور جوگندر سنگھ (سکھوں میں اقبال کے دو دوست بہت مشہور ہوئے جوگندر سنگھ اور سردار امراؤ سنگھ) ۔

جوگندر سنگھ ۲۵ مئی ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے ۔ انہیں انگریزی اور فارسی زبان میں خصوصی مہارت حاصل تھی ۔ مشہور رسالہ East & West کے مدیر بھی رہے "اسرار خودی" کی اشاعت پر کئی تعارفی مضامین لکھے ۔ کملا، لور جہاں اور نسرین ، ان کی مشہور کتابوں کے نام ہیں ۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی نامزد ہوئے ۔ ۱۹۱۹ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء تک پنجاب کے وزیر زراعت بھی رہے[۱۰] ۔

نواب ذوالفقار علی خان کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے "رجال اقبال"[۱۱] اور "معاصرین اقبال کی نظر میں[۱۲]" کے مصنفین نے ۱۸۷۳ء لکھا ہے جب کہ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی ۱۸۷۶ء لکھتے ہیں[۱۳] ۔ "فرہنگ اقبال" کے مصنف نے نواب صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۸۶۷ء لکھی ہے[۱۴] ۔ لیکن زیادہ قرین قیاس ۱۸۷۳ء ہے ۔ والد کا نام غلام محمد تھا ۔ جو بچپن ہی میں انتقال کر گئے ۔ ابتدائی تعلیم چیفس کالج لاہور سے حاصل کی ، پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے ۔ ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۶ء تک پیرس میں مقیم رہے پھر ۱۸۹۷ء میں کیمبرج چلے گئے، وہاں تین سال رہ کر ۱۹۰۰ء میں وطن واپس آئے اور لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی ۔ کوپینز روڈ پر "زر افشاں" کے

لام سے ایک کوٹھی تعمیر کی - ۱۹۰۹ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے - ۱۹۱۰ء میں ریاست پٹیالہ کے وزیراعظم ہوئے -

سردار جوگندر سنگھ ریاست کے ہوم منسٹر تھے - ۱۹۱۹ء میں سر کا خطاب ملا - ۱۹۲۰ء میں کونسل آف اسٹیٹ کے رکن منتخب ہوئے - ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی طرف سے مجلسِ اقوام میں مندوب منتخب ہو کر تشریف لے گئے - شیر شاہ سوری اور مہاراجا رنجیت سنگھ کی سوانح عمریوں کی وجہ سے خاصی شہرت پائی - اقبال سے نواب صاحب کی ملاقات ۱۹۰۸ء میں ہوئی - ہندوستان میں اقبال کے فکر و فن پر سب سے پہلی کتاب (A Voice from the East) آپ ہی نے لکھی - اس کتاب کے دیباچہ میں نواب صاحب رقمطراز ہیں :

> "اگر ایران کو تختِ طاؤس پر فخر ہے اور تاجِ برطانیہ کوہ نور پر ناز کر سکتا ہے تو اقبال یقیناً ملکِ سخن کے دربار کی زینت ہے"[۱۵] -

آخری عمر میں بعض حضرات کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اقبال اور نواب صاحب کے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہو گئے- نواب صاحب نے ۲۶ مئی ۱۹۳۷ء کو ڈیرہ دون میں انتقال کیا -

اقبال کی زیر نظر نظم پر کچھ اصلاحات بھی ہوئیں - چودھری محمد حسین کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم پر اصلاح کا عمل ۱۹۲۴ء میں ہوا - بانگِ درا کی شاعت سے پہلے اس میں شامل نظموں میں اصلاح اور اضافوں کا کام ۱۹ فروری ۱۹۲۴ء کو شروع ہوا - روزانہ دس پندرہ نظموں پر نظرثانی کی جاتی تھی - کتاب کی اشاعت سے پہلے نظموں پر ایک دفعہ پھر اصلاح ہوئی- اقبال کی بیاض اور بانگ درا میں مطبوعہ نظم کے متن میں اصلاح کا عمل درج ذیل گوشوارے کی مدد سے بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے :

شعر نمبر	اولین متن (بیاض کی روشنی میں)	اصلاح شدہ متن (بانگِ درا کی روشنی میں)
شعر ۱	مصرع اولیٰ جت الدر	جگندر
شعر ۴	مصرع ثانی نکہت	نگہت[۱۶]

شعر ۴ مصرع ثانی موجِ شمیم گل ہے نکہت کا کاروں ہے

شعر ۵ میخانے میں ہے لیکن مزاج

اشعار کی ترتیب اور تعداد میں کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئی۔ جگندر سنگھ نے بڑے نکتے کی بات کی اور کہا کہ نواب سر ذوالفقار علی خان کا موٹر بجلی کی مانند تیز ہونے کے باوجود ساکت ہوا کی طرح خاموش ہے اور ذرا بھی پُر شور نہیں۔ اقبال اس تبصرے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ صرف موٹر ہی پر منحصر نہیں، زندگی کے سفر میں جو لوگ سبک رفتار ہوتے ہیں وہ خاموش ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس نکتے کو بیان کرنے کے بعد اقبال روزمرہ زندگی سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ پہلی مثال گھنٹی کی ہے جو شور اور فریاد کی عادی ہے شاید اس لیے کہ اس کے پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں اور چل نہیں سکتی۔ خوشبو صبا کی طرح خاموش ہوتی ہے شاید اسی لیے بڑی تیزی کے ساتھ چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ صراحی ساکن رہتی ہے اسی لیے اس سے شراب انڈیلتے وقت ایک مخصوص آواز نکلتی ہے۔ جام بھی خاموش رہتا ہے لیکن پوری محفل میں گردش کرتا رہتا ہے۔ یہی حال شاعر کے تخیل کا ہے کہ وہ خاموش ہوتا ہے لیکن اس کی پرواز آسمانوں کی بلندیوں کو چھوتی ہے۔ اسی خاموش تخیل میں آواز کی گرمی اور تاثیر پیدا ہوتی ہے گویا گرمی آواز کا اصل سرمایہ خاموشی ہے۔

اقبال اس نظم سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جادۂ حیات پر گامزن ہر تیز رفتار چیز فطرتاً خاموش ہوتی ہے۔ گویا خاموش اشیاء میں قوت محرکہ ٹوٹ ٹوٹ کر اکٹھی ہوتی ہے۔ اقبال کی فلسفہ طراز طبیعت اس نظم سے بخوبی عیاں ہے۔ نظم مختصر سہی لیکن فنی اور فکری اعتبار سے اقبال کی نمایندہ نظم کہلانے کی مستحق ہے۔

حواشی

۱۔ تلمیحات و اشارات اقبال، ۱۹۸۶ء، ص ۵۱۵۔

۲۔ بانگ درا، ص ۲۱۱۔

۲ - ایضاً ، ص ۲۲۰ -

۴ - ایضاً ، ص ۱۹۸ -

۵ - ملفوظات اقبال از محمود نظامی ، مرتبہ ابواللیث صدیقی ۱۹۷۷ء ، ص ۹۵-

۶ - تلمیحات و اشارات اقبال ۱۹۸۶ء ، ص ۳۱۵ -

۷ - مشمولہ ''بیاض بانگِ درا'' اول (مملوکہ اقبال میوزیم ، لاہور)، ص ۹۹ -

۸ - نامی ڈاڈری چودھری محمد حسین مملوکہ نفیس احمد باجوہ مشمولہ ''چودھری محمد حسین اور اقبال''، مقالہ ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی ، از ثالث نفیس

۹ - تلمیحات و اشارات اقبال ۱۹۸۶ء ، ص ۳۱۴ -

۱۰ - Indian Year Book & Who's Who 1939 40، ص ۱۰۲۴ — ۱۰۲۵-

۱۱ - مصنفہ عبدالرؤف عروج ، ص ۲۹۳ -

۱۲ - مصنفہ عبداللہ قریشی ، ص ۲۵۶ -

۱۳ - تلمیحات و اشارات اقبال ۱۹۸۶ء ، ص ۳۱۵ -

۱۴ - فرہنگ اقبال از نسیم امروہوی ۱۹۸۷ء ، ص ۵۶۵ -

۱۵ - A Voice from the East دیباچہ ذوالفقار علی خاں -

۱۶ - بظاہر یہ کاتب کی اصلاح معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ لفظ عربی ہے اس لیے کاف ہی صحیح ہوگا (مدبر) -

اختر النساء *

یوسف سلیم چشتی بطور شارح اقبال

پروفیسر یوسف سلیم چشتی (۱۸۹۵ء تا ۱۹۸۴ء) کا شمار معروف اقبالی مصنفین میں ہوتا ہے۔ ان کی سب سے نمایاں حیثیت ایک شرح نویس کی ہے۔ چشتی صاحب کی علمی باقیات کا بیشتر حصہ اردو کے تین نامور شعراء مرزا غالب، اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ ان کی تحریر کردہ، کلام غالب اور کلام اقبال کی شرحیں ان کی شہرت اور مقبولیت کا باعث ہیں۔ بلاشبہ انھوں نے غالب و اقبال کی شرح نویسی کے ذریعے، اردو کے دو بڑے شاعروں کے فکر و فلسفے کے تفہیم میں اہم کردار ادا کیا۔ ہزاروں طلبہ اور شایقین ادب، چشتی صاحب کی شرح نویسی سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ استفادے کا یہ سلسلہ تقریباً نصف صدی سے جاری ہے۔

بحیثیت شارح کلام اقبال، اقبالیاتی ادب میں چشتی صاحب نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ چشتی صاحب کا یہ غیر معمولی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اقبال جیسے بڑے شاعر کے کلام کی شرحیں لکھنے کا کام ایک ایسے دور میں انجام دیا، جب بہت کم لوگ اس طرف متوجہ تھے۔ انھوں نے کمر ہمت باندھی اور اقبال کے پورے اردو اور فارسی کلام کی مفصل اور سیر حاصل شرحیں تحریر کیں۔ ان کی شرحوں نے اقبالیاتی شرح نویسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی شرحیں اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے ایک خاص مرتبے کی حامل ہیں، اور بعض خصوصیات کی بنا پر انھیں دیگر شارحین سے امتیاز بخشتی ہیں۔ ان کی کتب شروح کا آغاز بالعموم ایک طویل مقدمے سے ہوتا ہے۔ شرح جاوید نامہ کا مقدمہ ۱۹۵ صفحات، شرح بانگ درا کا مقدمہ

---

* لیکچرر اردو، گورنمنٹ گرلز کالج، جہلم۔

۳۹ صفحات اور شرح بال جبریل کا مقدمہ ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ ان مقدموں میں انہوں نے تحقیق و جستجو سے کام لیتے ہوئے بہت قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں ۔ یہ مقدمات ان کی ادبی فہم و بصیرت اور تحقیقی مزاج کے آئینہ دار ہیں ۔ ایسے جامع مقدمے کسی دوسرے شارح اقبال نے تحریر نہیں کیے ۔ مولانا غلام رسول مہر شارحین اقبال میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں ، لیکن ان کے مقدمے بھی مختصر ہیں ۔

شرح نویسی میں چشتی صاحب کا طریق کار یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے نظم کا لام یا غزل کا نمبر تحریر کرتے ہیں (کیونکہ کاپی رائٹ کی وجہ سے کلام اقبال کا متن نقل کرنے کی اجازت نہیں تھی) پھر مشکل الفاظ کے معانی بصورت ''حل لغات اور تشریح مشکلات'' اضافہ کرتے ہیں ۔ جن نظموں ، غزلوں یا اشعار کی شرح کی ضرورت نہیں سمجھتے ان کے حل لغات ہی پر اکتفا کرتے ہیں ۔ بعض نظموں پر تبصرہ اور تمہید لکھ دیتے ہیں اور بعض نظموں کے خلاصے اور بنیادی خیال بھی درج کرتے ہیں ۔

کلام اقبال میں بہت سے الفاظ و تراکیب ، فقہ ، منطق ، تصوف ، فلسفہ ، نجوم ، طبیعات ، دین اور موسیقی سے متعلق ایسی علمی و ادبی اصطلاحات اور تلمیحات کا استعمال ہوا ہے ، جو ایک عام قاری کی فہم سے بالاتر ہیں اور ان کی وضاحت کے بغیر شعر فہمی میں دقت ہوتی ہے ۔ اصطلاحات اور تلمیحات سمجھ میں آ جائیں تو مطالعۂ اقبال کا لطف دو چند ہو جاتا ہے ۔ چشتی صاحب نے اس ضمن میں بڑی محنت ، ژرفہی اور اہتمام سے کام لیا ہے اور کلام اقبال کی تشریح کرتے وقت الفاظ و تراکیب کے لغوی معانی ہی نہیں بتائے ، ان کا اصطلاحی مفہوم بھی بڑی خوبی اور مہارت سے واضح کر دیا ہے ۔ مثلاً ''بال جبریل'' کی نظم '' حکیم سنائی کے مزار پر '' کے پہلے بند کے دوسرے شعر :

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

میں موجود لفظ ''طلسم'' کے لغوی اور اصطلاحی معانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''طلسم کے لغوی معانی : یہ یونانی لفظ تالسما یا تولسا کا مُعرّب ہے اور اس کے کئی معنی ہیں۔ مثلاً جادو کی ایک خاص قسم، پر مکتوم، نہایت پوشیدہ راز ، کسی امر کی تکمیل ، کسی مبتدی کو کسی مخفی مذہب میں داخل کرنا ، تعویذ یا نقش مرتب کرنا ، منتر پڑھنا یا جادو کرنا . رفتہ رفتہ یہ لفظ ''سحر'' کا مترادف بن گیا . . .

اصطلاحی معانی :

ایسی چیز جس کی اصلیت یا حقیقت یا کوئی مستقل وجود نہ ہو اور یہ مفہوم اس لیے پیدا ہوا کہ جادو یا سحر کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ۔ مثلاً : جادو گر ہتھیلی پر سرسوں جما کر دکھا دیتا ہے یا رسی کو سانپ بنا دیتا ہے ، لیکن ہم جانتے ہیں کہ درحقیقت نہ سرسوں کا وجود ہوتا ہے نہ سانپ کا''۔

''بال جبریل'' کی نظم ''جاوید کے نام'' کے پہلے شعر :

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ

میں لفظ ''ساز'' اور ''سوز'' کے مختلف معانی بڑی خوبی سے بیان کیے ہیں :

'' یہ لفظ کثیر المعانی ہیں، ساز کے معنی ہیں : ساز و سامان، اسباب خانگی ، اسلحہ ، سامانِ جنگ ، آلاتِ موسیقی ، مطابقت ، موافقت ، ہم آہنگی ، ضیافت ، زادِ راہ ، عقل و خرد ۔

''سوز کے معنی ہیں : جلن ، آگ ، حرارت ، گرمی ، محبت ، عشق ، جوش و خروش ، ولولہ ، سوز و گداز ، تاثر یا کیفیات''۔

''بانگ درا'' کی نظم ''تصویر درد'' کے ایک شعر :

کنوئیں میں تو نے یوسف کو ، جو دیکھا بھی ، تو کیا دیکھا
ارے غافل ! جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے

میں ''مطلق'' کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

''مطلق ؛ منطق کی اصطلاح ہے ، مقید کی ضد ہے ، مطلق وہ جو تمام قیود و حدود سے بالا تر ہو ۔ مثلاً اللہ کی ذات مطلق ہے ۔ چنانچہ خدا کو ذاتِ مطلق سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ ہم اس پر قیود وارد نہیں کر سکتے[۲] ''۔

''بالِ جبریل'' کی چھٹی غزل کے پانچویں شعر کے دوسرے مصرع :

ع وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے

میں موجود تلمیح کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''افسانۂ دنبالۂ محمل تلمیح ہے جس میں مجنوں کے اس مشہور واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ ایک دفعہ مجنوں نے اپنا ایک قاصد لیلیٰ کے پاس روانہ کیا تھا ۔ لیکن خود بھی برابر دور تک محمل کے ساتھ ساتھ قاصد سے باتیں کرتا ہوا چلا گیا تھا کہ جب تم لیلیٰ سے ملو تو یہ کہنا ، یہ کہنا[۳] ''۔

علامہ کے اشعار میں معنی کی ایک دنیا آباد ہے ۔ ہر شعر میں مختلف حقائق و معانی مستور ہیں ۔ چشتی صاحب نے بقدر ہمت ان تمام حقائق معانی اور اصطلاحات و تلمیحات کو بہ وضاحت ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور مفہوم کے تعین میں خاصی شرح و بسط سے کام لیا ہے ۔ شارحین اقبال میں چشتی صاحب کے علاوہ یہ خصوصیت مولانا مہر کے ہاں بھی نظر آتی ہے مگر مولانا مہر مائل بہ اختصار ہیں ۔ چشتی کا انداز زیادہ توضیحی اور تحقیقی ہے ۔ دراصل چشتی صاحب ایک وسیع المطالعہ شخص تھے ۔ وہ فلسفہ ، منطق ، موسیقی ، نجوم اور دیگر علوم سے بہرہ ور تھے ۔ شرح نویسی میں انھوں نے اپنے اس وسیع مطالعے سے قارئین کے علم میں اضافہ کرنے کی سعی کی ہے ۔ ان کی یہ سعی قابل قدر اور علمی افادیت کی حامل ہے ۔

علامہ اقبال کی بعض نظموں میں عہد قدیم اور عہد جدید کے مشرقی و مغربی مفکرین و فلاسفر ، حکما ، ادبا ، شعرا اور بعض دیگر شخصیات کا تذکرہ ملتا ہے ۔ مثلاً : داغ ، بیدل ، آرنلڈ ، شبلی ، حالی ، ابو الحسن اشعری ، خواجہ

فرید الدین عطار ، افلاطون ، ابو القاسم محمود، مسعود سعد سلمان، مارٹن لوتھر، نپولین ، مسولینی ، نادر شاہ ابو العلا معری ، ٹیپو سلطان ، اسپینوزا ، مجدد الف ثانی وغیرہ جیسی معروف شخصیات ۔ چشتی صاحب نے اپنی شرحوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ ان شخصیات کی مختصر سوانح حیات ، شخصی و ادبی خصوصیات اور ان کے افکار و نظریات کا ذکر کیا ہے یعنی تشریحی مواد کے ساتھ ساتھ سوانحی مواد بھی فراہم کیا ہے ۔ چشتی صاحب اس ضمن میں بھی دیگر شارحین سے بہت آگے نظر آتے ہیں کیوں کہ ہمارے بیشتر شرح نویسوں نے شخصیات پر اس تفصیل سے قلم نہیں اٹھایا ۔

چشتی صاحب تاریخ سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔کلام اقبال میں جہاں کسی تاریخی واقعے یا تاریخی شہر یا کسی تاریخی شخصیت کا ذکر آیا ہے چشتی صاحب نے بڑی جامعیت اور اختصار سے گرانقدر معلومات فراہم کر دی ہیں ۔ اس ضمن میں انھوں نے بغداد ، قسطنطنیہ ، دہلی ، قرطبہ ، بابل ، گولکنڈہ اور مدینہ منورہ وغیرہ کے بارے میں قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں ۔

چشتی صاحب شرح نویسی میں اہم نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے پہلے ان کی تمہید تحریر کرتے ہیں اور اس میں وہ متعلقہ نظم کے بارے میں تمام اہم باتیں جمع کر دیتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ نظم کب اور کس کے بارے میں لکھی گئی ، کس رسالے میں شائع ہوئی وغیرہ ۔ یہ خصوصیت شارحین اقبال میں چشتی کے علاوہ صرف مولانا مہر کے ہاں دکھائی دیتی ہے لیکن مولانا مہر بہت اختصار سے کام لیتے ہیں ۔

چشتی صاحب بعض اوقات اہم نظموں ، غزلوں اور اشعار کا بنیادی تصور چند الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں ۔ یہ خصوصیت اگرچہ ہر جگہ نظر نہیں آتی تاہم شارحین اقبال میں صرف چشتی صاحب کے ہاں ہی یہ خوبی موجود ہے 'بانگ درا' کی نظم "۔۔۔ کی گود میں بلی دیکھ کر" کا خلاصہ درج ذیل چند الفاظ میں بیان کیا ہے :

> "اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ محبت فطری جذبہ ہے، جو ہر ذی روح میں پایا جاتا ہے"۔

"بانگ درا" کی ایک نظم "گل رنگیں" کا بنیادی تصور اس طرح بیان کیا ہے :

"اس نظم میں بنیادی تصور یہ ہے کہ پھول بہت دلکش ہوتا ہے لیکن اس میں تحقیق اور تلاش کا مادہ نہیں ہے اور انسان اگرچہ سراپا درد و غم ہے ، یکسر سوز و گداز ہے ۔ لیکن اس میں ادراک یعنی علم حاصل کرنے کی قوت موجود ہے[۶]"۔

علاوہ ازیں اشعار کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے دوسرے شعرا جیسے غالب ، داغ ، مولانا ظفر علی خان ، ذوق ، اکبر الہ آبادی ، سعدی ، حافظ ، بیدل ، رومی ، جامی اور اقبال کے اپنے برمحل اشعار کے حوالے بھی دیے ہیں ۔ اس کے علاوہ قرآنی آیات اور قریب المعنی مصرعوں کا استعمال بھی کیا ہے ۔ اس ضمن میں چشتی صاحب نے یہ اہتمام کیا ہے کہ قرآنی آیات درج کرتے وقت ان کا اردو ترجمہ اور بعض اوقات پارہ نمبر اور آیت نمبر بھی ساتھ درج کردیا ہے ۔

"بال جبریل" کی پہلی شعر :

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

کی تشریح کرتے وقت مختلف شعرا کے اردو اور فارسی کے چودہ اشعار نقل کیے ہیں ۔ اسی غزل کے پانچویں اور آخری شعر کی شرح بیان کرتے وقت دس اشعار کا حوالہ دیا ہے ۔

"بال جبریل" کی نظم "حکیم سنائی کے مزار پر" کے پہلے بند کے دوسرے شعر کی تشریح کرتے وقت مندرجہ ذیل آیات درج کی ہیں :

الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض ٥ (۲۲ : ۶۵)

ترجمہ : کیا تو نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے جو کچھ زمین میں ہے ۔

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السمٰوت و ما فی الارض ٥ (۲۰ : ۳۱)

ترجمہ : کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے ۔ اللہ نے ان سب کو تمھارے لیے مسخر کر

دیا ہے"۔

چشتی صاحب نے اپنی شرحوں میں یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ جو الفاظ، تراکیب، مصرعے یا اشعار، دیگر شعرا کے اشعار یا قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں، انھوں نے بڑی محنت اور تحقیق سے کام لیتے ہوئے ان اشعار کی نشاندہی کا کام سرانجام دیا ہے، ساتھ ہی شاعر کا نام اور متعلقہ اشعار، قرآنی آیات اور ان کا ترجمہ بھی لکھ دیا ہے - اس سے یہ آسانی ہو گئی ہے کہ ان مضامین سے ملتے جلتے دوسرے شعرا کے مضامین کا پتہ چل جاتا ہے مثلاً "بانگِ درا" کی نظم "شکوہ" کے انیسویں بند کے تیسرے شعر :

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

کے دوسرے مصرع کے بارے میں لکھتے ہیں :

یہ مصرع داغ کے اس شعر سے ماخوذ ہے :

ہم سا جانباز زمانہ میں نہ پاؤ گے کہیں
لاکھ ڈھونڈو گے چراغِ رخِ زیبا لے کر[۸]

"بالِ جبریل" کی شروع کی پندرھویں غزل کے چوتھے شعر :

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل ؟
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

کے متعلق فرماتے ہیں :

"یہ شعر قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔
افحسبتم انما خلقنٰکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون ٥ (۲۳ : ۱۱۶)

ترجمہ : اے لوگو ! کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں یونہی بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے[۹]"۔

علامہ نے بعض شعرا (الیسی شاملو، ملا عرشی، رضی دانش، ملک قمی، غنی، مرزا مظہر جانِ جاناں، صائب، عرفی) کے اشعار پر تضمینات

کی ہیں۔ چشتی صاحب نے ان کی وضاحت کرتے ہوئے شاعر کا نام اور اس کا مختصر مگر جامع تعارف کرایا ہے۔

''بانگ درا'' کی نظم ''تضمین برشعر انیسی شاملو'' کے مندرجہ ذیل شعر :

وفا آموختی از ما ، بکار دیگراں کردی
ربودی گوہرے ازما ، نثار دیگراں کردی

کے بارے میں بڑے اہتمام[10] سے کام لیا ہے۔

چشتی صاحب نے مولانا مہر کی طرح ، بعض غزلوں اور نظموں کے ایسے اشعار بھی لکھ دیے ہیں جو علامہ نے بانگ درا کو ترتیب دیتے وقت حذف کر دیے تھے۔ مثلاً ''بانگ درا'' کی نظم ''صدائے درد'' کے حذف شدہ مندرجہ ذیل اشعار چشتی صاحب نے درج کیے ہیں :

بار لے چل مجھے اے کشتی موج اٹک
اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک

الوداع اے سیرگاہ شیخ شیراز الوداع
اے دیار بالمیک نکتہ پرداز الوداع

الوداع اے مدفن ہجویری اعجاز دم
رخصت اے آرام گاہ شنکر جادو رقم''

علامہ اقبال کے بعض اشعار مختلف المعانی ہیں اور ان کی ایک سے زیادہ تعبیرات ہو سکتی ہیں مگر اس کے لیے غور و خوض کی ضرورت ہے لیکن بیشتر شارحین نے اس ضمن میں محنت سے کام نہیں لیا اور اشعار کی مختصر اور سرسری شرح پر ہی اکتفا کیا ہے اور اشعار کے تمام مفاہیم کو واضح نہیں کیا ہے لیکن چشتی صاحب ایسے اشعار کی شرح کرتے وقت محنت ، وضاحت ، تحقیق اور شعر فہمی کی پوری بصیرت کو بروئے کار لائے ہیں اور بعض ایسے نکتے بیان کیے ہیں ، جن کی طرف دیگر شارحین کی نظر نہیں گئی ، مثلاً : نظم ''ہمالہ'' کے ایک شعر :

چھیڑتی جا اس عراق دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

کی شرح مولانا سحر نے اس طرح کی ہے :

اے چلنے والی ندی تو دل میں گھر کرنے والے راگ کا ساز چھیڑتی جا ۔ دل تیری آواز کو خوب سمجھ رہا ہے[۱۲]"۔

ڈاکٹر باقر تحریر فرماتے ہیں :

"اے مسافر (ندی) (تو) اس دل میں گھر کرنے والی عراق (راگ) کے ساز کو چھیڑتی جا ۔ (میرا) دل تیری آواز کو (خوب) سمجھتا ہے[۱۳]" ۔

آقائے رازی لکھتے ہیں :

"اے ندی تو اس دلنشیں نغمے کے ساز کو بجاتی جا ۔ کیونکہ تیری آواز کی دلفریبی اور سحر انگیزی کو میرا دل خوب جانتا ہے[۱۴]" ۔

ڈاکٹر عارف بٹالوی نے اس طرح وضاحت کی ہے :

"اے جوئے رواں، میرے دل میں جو بسی ہوئی موج ہے، اسے بھی بیدار کرتی جا ۔ کیونکہ تو اور میرا دل دونوں قدرت کے ہمراز ہیں[۱۵]" ۔

چشتی صاحب نے اس کے دو مطالب بیان کیے ہیں :

"چونکہ پہاڑی ندیوں کے بہنے سے بہت خوش آیند آوازیں پیدا ہوتی ہیں اس لیے شاعر نے "ندی" کو ایک گویا، ماہر موسیقی فرض کر کے اس سے خطاب کیا ہے کہ اے ندی ! تیری طرح میرا دل بھی نغموں سے لبریز ہے ۔ میں تیرا ہمدم اور ہمراز ہوں ، اس لیے تو میرے دل کے ساز کو بھی چھیڑتی جا ، جس میں نہایت دلکش موسیقی پوشیدہ ہے ۔

"اقبال کے یہاں "ندی" زندگی کی علامت ہے ۔ یعنی وہ زندگی کو ندی یا جوئے آب سے تشبیہ دیا کرتے ہیں ۔ چنانچہ اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۵۰ پر جو نظم انھوں نے "فلسفۂ غم" کے عنوان سے لکھی

ہے - اس میں وہ لکھتے ہیں :

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

اس معنی کو مدِ نظر رکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اے ندی ! میرا دل تیری حقیقت سے آگاہ ہے کیونکہ جس طرح تو مسلسل رواں ہے، انسانی زندگی بھی اسی نہج پر بسر ہو رہی ہے - یعنی یہی حال حیاتِ انسانی کا ہے[۱۶]"۔

اسی شعر کے متعلق آگے چل کر تبصرہ کرتے ہوئے چشتی صاحب نے ایک نکتہ یوں بیان کیا ہے :

"چھیڑتی جا ، کہہ کر اقبال نے شخصی رنگ پیدا کر دیا ہے اور اس طرزِ خطاب سے پوری نظم میں زندگی پیدا ہو گئی ہے[۱۷]"۔

اس طرح کے تقابلی مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ چشتی صاحب نے بڑے غور و فکر ، سوچ بچار اور گہرے تامل کے بعد ان اشعار کے مفاہیم کی وضاحت کی ہے -

اپنی شرحوں میں چشتی صاحب نے بعض مقامات پر اپنے آیندہ اقبالیاتی تصنیفی منصوبوں اور بعض غیر مطبوعہ تصانیف کا ذکر بھی کیا ہے - مثلاً : راجا بھرتری ہری کی تصنیف "شٹک ترجم" کے متعلق لکھتے ہیں :

"اس کتاب کا مفصل تذکرہ تو میں انشاء اللہ " فرہنگِ اقبال" میں درج کروں گا[۱۸] "۔

"انشاء اللہ . . . "اقبال اور تصوف" پر ایک مستقل کتاب لکھوں گا[۱۹]" -

"اس بات کو اپنی تصنیف "ادب اردو پر اقبال کے احسانات" میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کروں گا[۲۰] "۔

"حکیم سنائی کے مفصل حالات اور کلام پر تبصرہ تو انشاء اللہ تعالیٰ "فرہنگ اقبال" میں درج کروں گا[۲۱]"۔

''فقر ، اقبال کی اصطلاح ہے ، میں نے اس کی تشریح میں دو سو صفحے کی کتاب انگریزی میں لکھی ہے ، جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی[۲۲] ''۔

''اقبال نے موجودہ نظام تعلیم کی خرابیوں پر جو کچھ لکھا ہے اگر اسے جمع کیا جائے تو بجائے خود ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے اس لیے میں اس موضوع پر عنقریب جدا گانہ کتاب لکھوں گا[۲۳]''۔

بہت سی خوبیوں کے ساتھ چشتی صاحب کی شرح نویسی میں چند خامیاں بھی دکھائی دیتی ہیں، جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ۔ مثلاً : وہ بعض نظموں اور غزلوں کی شرح نامکمل چھوڑ دیتے ہیں ۔ بعض نظموں کو تو نظر وہ بالکل نظر انداز کر گئے ہیں اور ان کی شرح تحریر نہیں کی ۔ مثلاً ''بانگِ درا'' کی مندرجہ ذیل نظموں کی شرح نہیں کی ہے :

'' بچے کی دعا'' ، ''ماں کا خواب'' ، ''ایک گائے اور بکری'' ، ''پرندے کی فریاد'' اسی طرح بعض نظموں یا غزلوں کا صرف خلاصہ لکھنے یا تبصرہ کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے ۔

چشتی صاحب سے بعض اوقات اعتدال اور توازن کا دامن چھوٹتا نظر آتا ہے چنانچہ بعض اوقات محض ایک شعر یا نظم کی شرح متعدد صفحات پر مشتمل ہوتی ہے ۔ لیکن جہاں سکڑنے سمٹنے لگتے ہیں ، وہاں پوری کی پوری نظمیں چھوڑ دیتے ہیں اور لکھ دیتے ہیں کہ نظم آسان ہے یا اس میں کوئی تشریح طلب بات نہیں[۲۴] ۔ حالانکہ ایسی نظموں میں بھی کئی الجھنیں ہوتی ہیں ۔

شرح کرتے وقت بعض اوقات طویل مباحث[۲۵] چھیڑ دیتے ہیں ۔ جن کا شعر کی تشریح سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ اس ضمن میں وہ جگہ جگہ اپنے نوٹ[۲۶] درج کر دیتے ہیں ، جو طوالت کا باعث بنتے ہیں ۔ یوں طوالت کے باعث اصل بات غیر مؤثر اور مبہم ہو جاتی، ہے جس سے قاری اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے ۔ مثلاً ''بالِ جبریل'' کی پہلی غزل کے پانچ اشعار کی شرح چالیس صفحات[۲۷] پر مشتمل ہے ۔

دورانِ شرح وہ بعض تلمیحات ، تراکیب اور اصطلاحات کی وضاحت سے دامن بچا کر گزر گئے ہیں ۔ اسی طرح دوسرے شعرا کے اشعار سے استشہاد کرتے

بعض اوقات تو شاعر کا نام بتا دیتے ہیں لیکن بعض اوقات صرف شعر درج کرنا کافی سمجھتے ہیں اور شاعر کے نام کی نشاندہی نہیں کرتے اور اس طرح کا انداز اختیار کرتے ہیں :

''اسی نکتہ کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے[۲۸]''۔

''اسی حقیقت کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے[۲۹]''۔

''اسی مضمون کو ایک گمنام شاعر نے یوں ادا کیا ہے[۳۰]''۔

بعض اوقات حوالہ دیتے وقت غلط معلومات دے جاتے ہیں ۔ مثلاً مرزا غالب کے ایک شعر :

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان ، لیکن پھر بھی کم نکلے

کو داغ[۳۱] کے نام سے منسوب کیا ہے ۔ یہی غلطی انہوں نے ''شرح بالِ جبریل[۳۲]'' میں بھی کی ہے ۔

شرح کرتے وقت اکثر اوقات وہ ایک واعظ اور مبلغ کا روپ دھار لیتے ہیں ۔ یوں ضمنی مباحث میں پڑ کر اصل موضوع سے دور ہو جاتے ہیں اور لمبا چوڑا وعظ شروع کر دیتے ہیں[۳۳] ۔

چشتی صاحب اور علامہ اقبال کے بعض اشعار کو وحدت الوجود کا حامل سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ ان اشعار کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں پھر بھی وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ثابت کریں کہ علامہ اقبال وحدت[۳۴] الوجود کے قائل تھے ۔ اس طرح کلام اقبال کی حقیقی تفہیم میں کئی دشواریاں جنم لیتی ہیں اور قاری مفہوم سمجھنے کے بجائے ان بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے ۔ چشتی صاحب کی شرح نویسی کی انہی خامیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں :

''یوسف سلیم چشتی شرح لکھتے لکھتے اکثر بہک جاتے ہیں ۔ فلسفے اور تصوف پر طویل بحثیں چھیڑ دیتے ہیں ۔ بعض اوقات ایک ایک شعر کی شرح کئی کئی صفحات پر پھیل جاتی ہے مگر جہاں سمجھنے پر آتے ہیں وہاں پوری پوری نظمیں گول کر جاتے ہیں ۔ وہ بعض

اشعار کی شرح کرتے ہوئے اقبال کو بھول جاتے ہیں اور اپنے تعصبات تفصیل سے بتانے لگتے ہیں . . . ان کی شرحوں میں کئی تکنیکی خامیاں ہیں ، نہ کہیں فہرست مندرجات ہوتی ہے ، نہ اندرونی صفحات پر نظم کا عنوان ، شعر کا نمبر بھی کبھی کبھی غائب ہوتا ہے . اس لیے کسی شعر کی شرح تلاش کرنا دشوار ہو جاتا ہے[۳۵]"۔

لیکن ان چند کوتاہیوں سے ان کی شارحانہ اہمیت کم نہیں ہوتی - ان کے ہاں وہ شارحانہ نظر موجود ہے جو ایک شارح کے لیے ضروری ہے -

چشتی صاحب کا وسیع مطالعہ اور اس مطالعے کا ماحصل قابل تحسین ہے - انھوں نے اپنی شرحوں میں وہ سارا مواد جمع کر دیا ہے جس سے اقبال فہمی میں مدد ملتی ہے - چشتی صاحب نے یہ شرحیں لکھ کر اقبال شناسی میں آسانی پیدا کر دی ہے . ان کی شرحوں کے مطالعے سے طلبہ مستفیض ہوتے اور اہل علم ان کی قدر کرتے ہیں . اقبالیاتی ادب کے کسی معاملے میں چشتی صاحب سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو لیکن بحیثیت شارح کلام اقبال انھوں نے اقبالیات کی ترویج و ترقی کے لیے جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ان سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا - چشتی واحد شارح ہیں جنھوں نے اقبال کے تمام مجموعوں (اردو اور فارسی) کی شرح لکھی ہے - ان کا مطالعہ اقبال فہمی اور اقبال شناسی میں مفید ثابت ہوتا ہے- تفہیم اقبال کے سلسلے میں ان کی شارحانہ اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا - ان کی شرحوں کی اشاعت کے بعد جن شارحین نے شرحیں لکھیں وہ اپنی شرحوں میں کوئی اضافہ کر سکے- کلام اقبال کی سب سے پہلے شرح لکھ کر چشتی صاحب نے اقبالیاتی ادب میں اہم مقام حاصل کر لیا -

بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی :

"ان کی شرحوں سے اقبال فہمی کا ایک شعور پیدا ہوا - فروغ اقبالیات کی گذشتہ نصف صدی کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں چشتی صاحب کا نام بہت نمایاں ہوگا[۳۶]"۔

حواشی

۱ - یوسف سلیم چشتی ، شرح بال جبریل ، عشرت پبلشنگ ہاؤس ، لاہور ، چہارم ، س ن ، ص ۲۰۷ -

۲ - ,, ,, ایضاً ، ص ۵۶۳ -

۳ - ,, ,, ، شرح بانگ درا ، عشرت پبلشنگ ہاؤس ، لاہور، چہارم، س ن ، ص ۲۹۲ -

۴ - ,, ,, ، شرح بال جبریل ، ص ۱۲۰ -

۵ - ,, ,, ، شرح بانگ درا ، ص ۲۰۴ -

۶ - ,, ,, ، ایضاً ، ص ۴۶ -

۷ - ,, ,, ، شرح بال جبریل ، ص ۲۱۲ -

۸ - ,, ,, ، شرح بانگ درا ، ص ۳۰۳ -

۹ - ,, ,, ، شرح بال جبریل ، ص ۱۹۰ -

۱۰ - ,, ,, ، شرح بانگ درا ، ص ۲۷۹-۲۸۰ -

۱۱ - ,, ,, ، ایضاً ، ص ۶۷ -

۱۲ - غلام رسول مہر ، مطالب بانگ درا ، شیخ غلام علی ، لاہور ، ۱۹۷۲ء ، ص ۱۷ -

۱۳ - محمد باقر ، ڈاکٹر ، شرح بانگ درا ، تاج بک ڈپو ، لاہور ، ۱۹۵۱ء ، ص ۸ -

۱۴ - آغائے رازی ، شرح بانگ درا ، ایم نرمان علی بک سیلرز ، لاہور ، س ن ، ص ۶۷۵ -

۱۵ - عارف پٹالوی ، شرح بانگ درا ، نیو بک پیلس ، لاہور ، ۱۹۷۸ء ، ص ۲۴ -

۱۶ - یوسف سلیم چشتی ، شرح بانگ درا ، ص ۴۳ -

۱۷ - ,, ,, ، ایضاً ، ص ۴۴ -

۱۸ - ,, ,, ، شرح بال جبریل ، ص ۴۵ -

۱۹ - ,, ,, ایضاً ، ص ۸۰ -

۲۰ - ,, ,, ایضاً ، ص ۱۱۸ -

۲۱ - ,, ,, ، ایضاً ، ص ۲۰۴ -

۲۲ - ,, ,, ، شرح ضرب کلیم ، عشرت پبلشنگ ہاؤس ، لاہور ، چہارم، ۱۹۴۹ء ، ص ۵۵ -

۲۳ - یوسف سلیم چشتی ، شرح ضرب کلیم ، ص ۴۳۴ -

۲۴ - ,, ,, ، شرح بال جبریل ، ص ۳۱۱ -

۲۵ - ,, ,, ، شرح بانگ درا ، ص ۵۱۸ -

۲۶ - ,, ,, ، ایضاً ، ص ۱۸۸ -

۲۷ - ,, ,, ، شرح بال جبریل ، ص ۸۵-۴۶ -

۲۸ - ,, ,, ، شرح ضرب کلیم ، ص ۲۱۹ -

۲۹ - ,, ,, ، شرح بال جبریل ، ص ۱۶۴ ،

۳۰ - ,, ,, ، ایضاً ، ص ۱۸۹ -

۳۱ - ,, ,, ، شرح بانگ درا ، ص ۲۴۶ -

۳۲ - ,, ,, ، شرح بال جبریل ، ص ۸۴ -

۳۳ - ,, ,, ، ایضاً ، ص ۲۴۳ -

۳۴ - ,, ,, ، شرح بانگ درا ، ص ۱۶۷ ، ۱۶۹ ، ۱۸۵ -

۳۵ - ,, ,, ، محمد زکریا ، ڈاکٹر ، اقبال کا ادبی مقام ، مکتبہ عالیہ ، لاہور ، ۱۹۷۷ء ، ص ۱۲۸ -

۳۶ - رفیع الدین ہاشمی ، ڈاکٹر ، ,, ۱۹۸۴ء کے اقبالیاتی ادب کا جائزہ ,, اقبال ریویو ، جولائی ۱۹۸۵ء ، ص ۸۷ -

صابر کلوروی

کلام اقبال کی اشاعت کی زمانی ترتیب

اخبار/رسالہ	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	عنوان	سال	ماہ
زبان دہلی	آپ تیغ یار توڑا سا نہ لے کر رکھ دیا	غزل	۱۸۹۳ء	ستمبر
"	ع کیا مزا بلبل کو آیا شیوۂ بیداد کا	"	"	نومبر
"	ع جان دے کر تمہیں جینے کی دعا دیتے ہیں	"	۱۸۹۴ء	فروری
شورِ محشر	ع تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے	"	۱۸۹۶ء	دسمبر
رودادِ انجمن	—	نالۂ یتیم	۱۹۰۰ء	۲۵/۲۳ فروری
پیسہ اخبار	(منشی محبوب عالم کے سفر یورپ پر)	خدا حافظ	"	۳۱/۲۳ مئی

ماخذ : بحوالہ رخت سفر، ص ۱۸۱

رودادِ انجمن	—	یتیم کا خطاب ہلال عید سے:	۱۹۰۱ء	۲۳/۲۲ فروری
مخزن	—	کوہستانِ ہمالہ	"	اپریل

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
مئی	”	گلِ رنگیں	—	”
جون	”	غزل	ع لب آتے ہیں اس میں تکرار کیا تھی	”
جولائی	”	عہدِ طفلی	—	”
			—	”
”	”	غزل	ع محبت کو دولت بڑی جانتے ہیں	ماخذ: بعنوان ”کشکول“
۱۵ ستمبر	”	قطعات	(i) کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے	کشمیری گزٹ
	”	(بسلسلہ کشمیر)	(ii) ظلم سہتے ہیں وطن اپنا نہ جن سے چھٹ سکا	”
			(iii) موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور	”
			(iv) سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر	
			(v) سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے	”
			(vi) پنجۂ ظلم و جہالت نے برا حال کیا	”
			(vii) بت پرستی کو مرے پیشِ نظر لاتی ہے	”
			(viii) کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے	

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
ستمبر	۱۹۰۱ء	مرزا غالب	—	مخزن
,,	,,	ہم نہ چھوڑیں گے دامن	—	کشمیری گزٹ
نومبر	,,	غزل	ع لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے	مخزن
۳۰ نومبر	,,	ابرِ کوہسار	—	پیسہ اخبار
۳۰ نومبر	,,		—	مخزن
۳۰ نومبر	,,	غزل	ع محبت کو دولت بڑی جانتے ہیں	,,
۳۰ نومبر	,,	,,	— مآخذ : 'عروسِ چمن' مرتبہ : محمد دین اوق	
جنوری	۱۹۰۲ء	شمع و پروانہ	— مآخذ : جادو گر ہندی نثراد ، ص ۳۱	خدنگِ نظر
جنوری	,,	غزل	ع لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے	پنجۂ فولاد
۲۱/۲۳فروری	,,	اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کے نام :		روداد انجمن
,,	,,	زبانِ حال	اسلامیہ کالج کا خطاب ہند دوم	,,
,,	,,	دین و دنیا	—	,,
فروری	۱۹۰۲ء	خیر مقدم	(لاٹ صاحب اور ڈائریکٹر کا خیر مقدم)	روداد انجمن
,,	,,	خفتگانِ خاک سے استفسار		مخزن

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۵ مارچ	،،	آمد لیفٹننٹ گورنر	ع زہے نشاطِ فراواں ...	پنجہ فولاد
		ماخذ : [خیر مقدم لاٹ صاحب]		
۱۹ ،،	،،	زبانِ حال	[اسلامیہ کالج کا خطاب بند نمبر ۱]	،،
۲۶ ،،	،،	،،	ع آج ہم حالِ دل درد آشنا کہنے کو ہیں	،،
		ماخذ : [اسلامیہ کالج کا خطاب بند دوم]		
،، ،،	،،	غزل	ع دل کی بستی عجیب بستی ہے	مخزن
۱۶ اپریل	،،	میں کون ہوں 'یتیم کا خطاب' ایک بند		پنجہ فولاد
،، ،،	،،	دلیا گیا ہے	،، ،،	،،
۲۳ ،،	،،	شام کی آمد	،، ،،	،،
		ماخذ : [بند ششم]		
،، ،،	،،	یتیم بچے کی فریاد	،، ،،	،،
		ماخذ : [بند ہشتم]		
،، ،،	،،	شمع و پروانہ	—	مخزن
۳۳ مئی	،،	خطِ منظوم	عقل و دل	پنجہ فولاد
،، مئی	،،	غزل	ع تم آزماؤ ہاں کو خدلکِ نظر زباں سے نکال کے لکھنؤ	
		ماخذ : بحوالہ تبرکات اقبال ، ص ۱۴		
،،	،،	خط منظوم	(عقل و دل)	مخزن
،،	،،	آفتاب سحر	(آفتاب صبح)	خدلک نظر
		ماخذ : بحوالہ جادو گر ہندی لٹراد ، ص ۳۲		

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۱۱ جون	,,	خطِ منظوم	(پیغام بیعت کے جواب پنجۂ فولاد میں)	

ماخذ: اقبال ریویو جولائی ۸۲ء، ص ۵

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۱۵ ,,	,,	اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے		رسالہ انجمن حمایت اسلام
,, ,,	,,	غزل	ع ہے کلیجہ فگار ہونے کو	مخزن
,, ,,	,,	صدائے درد	—	,,
,, جولائی	,,	ماہِ پسر	—	,,
۱۳ ,,	,,	خطِ منظوم	—	پنجۂ فولاد
,, ,,	,,	آفتاب	—	مخزن
,, ستمبر	,,	اسلامیہ کالج کا خطاب		پروانہ میرٹھ
,, اکتوبر	,,	غزل	ع عاشقِ دیدار حشر کا تمنائی ہوا	مخزن

ماخذ: بعنوان ,, کچکول"

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
,, دسمبر	,,	شمع	—	,,
,,	,,	ایک آرزو	—	,,
جنوری	۱۹۰۳ء	سید کی لوح تربت	—	,,
,,	,,	غزل	ع چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم	,,
۲۳ ,,	,,	عقل و دل	—	الحکم قادیان

(ماخذ: ,,بحوالہ معاصرین اقبال کی نظر میں)

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
,, ,,	,,	غزل	ع کیا کہوں اپنے چمن خدنگِ نظر سے میں جدا کیوں کر ہوا	
مآخذ : بحوالہ گیان چند ابتدائی کلام، ص ۱۹۱				
,, ,,	,,	,,	—	محزن
مآخذ : بعنوان ''کچکول''				
۷ فروری	۱۹۰۳ء	ایک صاحبِ دل کی آرزو	[ایک آرزو]	پنجۂ فولاد
۱۰/۱۷/۲۳ فروری	,,	عقل و دل	—	الحکم قادیان
مآخذ : بحوالہ گیان چند ابتدائی کلام ، ص ۲۸۳				
۲۷/۲۸ ,,	,,	فریاد است	[ابرِ کہر بار]	روداد انجمن
,, ,,	,,	غزل	ع تھا دکھانے دیکھنے کا خدنگ نظر کچھ تقاضا طور پر	
مآخذ : ابتدائی کلام اقبال				
۶/۲۰/۲۷ فروری	,,	ابرِ کہر بار	—	وطن اخبار
مآخذ: گیان چند ص ۳۹۵				
۱۴ مارچ	,,	,,	—	ہمدم اخبار
۲۱/۲۸ مارچ	,,	,,	—	,,
اپریل	,,	,,	—	روداد انجمن
,, ,,	,,	غزل	ع لڑکپن کے یہ دن صورت کسی کی بھولی بھالی ہے	محزن
,,	,,	,,	ع ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی	,,

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۹ مئی	,,	ایک شعر	ع غیرتِ تختۂ گلزار ہے مسکن تیرا	انتخاب لاجواب
ماخذ : [ابرِ کوہسار کا متروکہ شعر]				
۲۰ مئی	,,	ظاہر بینی	ع ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی	پیسہ اخبار
,,	,,	غزل	ع "اہلِ درد"	مخزن
,,	,,	,,	ع جو نہاں مجھ سے مرے داغِ جگر کی صورت	,,
ماخذ : بحوالہ گیان چند ۔ ص ۱۰۳ ، ابتدائی کلام ص ۳۰۱				
جون	,,	پنجۂ فولاد کیا ہے؟	—	کشمیری گزٹ
۹ جولائی	,,	ایک دردمند دل کی عرض	[برگِ گل]	وطن اخبار
ماخذ : ابتدائی کلام ، ص ۲۱۵				
۱۰ اگست	,,	غزل	ع پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے	خدنگ نظر
ماخذ : بیاضِ اعجاز ، ص ۵۷				
,, ,,	,,	,,	ع عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا	مخزن
ماخذ : بحوالہ دانائے راز عبداللطیف اعظمی ، ص ۲۲۰				
۱۷ ,,	,,	ایک دردمند دل کی عرض	—	پنجۂ فولاد
,, ستمبر	,,	شیشۂ ساعت کی ریگ	—	خدنگ نظر
ماخذ : بیاضِ شیخ اعجاز ، ص ۲۷۵				

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۲۸	،،	دردِ عشق		پنجۂ فولاد
		ماخذ : گیان چند ، ابتدائی کلام ، ص ۲۲۲		
،،	،،	برگِ گل	—	مخزن
،،	،،	انسان اور بزم قدرت	—	،،
یکم اکتوبر	،،	پیام صبح	—	اردوئے معلیٰ ، علی گڑھ
		ماخذ : بحوالہ اکبر حیدری		
،،	،،	غزل	ع کہوں کیا آرزوئے بیدلی	مخزن
			مجھ کو کہاں تک ہے	
۲۱	،،	،،	ع پاس والوں کو تو آخر	فتنہ و عطر فتنہ
			دیکھنا ہی تھا مجھے	
،، نومبر	،،	عشق اور موت	—	مخزن
،،	،،	دربار بہاولپور	—	،،
۴ دسمبر	،،	قصیدہ نعت نشینی نواب بہاولپور	[دربار بہاولپور]	وطن لاہور
		ماخذ : بحوالہ گیان چند ابتدائی کلام اقبال ، ص ۲۲۸		
۵	،،	عشق اور موت	—	پیسہ اخبار
،،	،،	زہد اور رندی	—	مخزن
۲۳ دسمبر	۱۹۰۳ء	پیامِ صبح	—	فتنہ و عطر فتنہ گورکھپور

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/ رسالہ
ماخذ بحوالہ ابتدائی کلام، ص ۲۱۱				
,,	,,	شاعر	—	مخزن
جنوری	۱۹۰۳ء	ترجمہ از ڈائک	—	,,
,,	,,	غزل	ع جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں	,,
,,	,,	,,	ع ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں	,,
فروری	,,	رخصت اے بزمِ جہاں	—	کشمیری گزٹ
,,	,,	طفلِ شیرخوار	—	مخزن
مارچ	,,	رخصت اے بزم جہاں	—	دکن ریویو
,,	,,	,,	—	مخزن
,,	,,	تصویرِ درد	—	,,
۱/۳ اپریل	,,	,,		رودادِ انجمن
مئی	,,	نالۂ فراق	—	مخزن
,,	,,	ماہِ نو	—	خدنگ نظر لکھنؤ
ماخذ: ابتدائی کلام اقبال، ص ۲۴۸				
جون	,,	غزل	ع کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے	مخزن
جون	,,	تصویر درد	—	رودادِ انجمن
جولائی	,,	چاند	—	مخزن
,,	,,	ابر	—	زمانہ

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
اگست	,,	غزل	ع انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں	دکن ریویو
ماخذ: بحوالہ دلگداز اگست ۱۹۰۴ء، ص ۲۴				
۱۶ ,,	,,	ہندوستاں ہمارا	—	اتحاد لکھنؤ
ماخذ: کلام اقبال، ص ۴۲۰				
ستمبر	,,	ہلال	—	مخزن
,,	,,	سرگذشتِ آدم	—	,,
,,	,,	ترانۂ ہندی	—	زمانہ
,,	,,	,,	—	مخزن
اکتوبر	,,	غزل	ع جو مضموں زندگی میں حرفِ موزوں ان کے نکلے ہیں	الکاشف
ماخذ: بحوالہ ہم قلم مضمون عابد رضا بیدار				
,,	,,	موجِ دریا	—	دکن ریویو
دسمبر	,,	جگنو	—	مخزن
,,	,,	صبح کا ستارہ	—	,,
,,	,,	غزل	سختیاں کرتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں	,,
,,	,,	ہلالِ عید	[یتیم کا خطاب بند نمبر ۱]	,,
,,	,,	غزل	ع دعا دیتا ہوں روتا ہوں گلہ کرتا ہوں قسمت کا	دکن ریویو
۷ جنوری	۱۹۰۵ء	صبح کا ستارہ	—	پنجۂ فولاد
جنوری	۱۹۰۵ء	دنیا	''یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے کا بند باز دہم	مخزن

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
فروری	,,	مفلسی	—	,,
,,	,,	ایک ہندوستانی لڑکے کا گیت	—	,,
١٠ مارچ	,,	,,	—	وطن اخبار
,,	,,	نیا شوالہ	—	مخزن
٥ اپریل	,,	,,	—	وطن اخبار
,,	,,	داغ	—	مخزن
٥ مئی	١٩٠٥ء	غزل	(i) مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے	فصیح الملک
,,	,,	,,	(ii) ,,	مخزن
جون	,,	رباعی	ع واعظ ترے فلسفے سے ہوں میں حیراں	زمانہ

ماخذ: بحوالہ تبرکات اقبال، ص ٢٠

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
,,	,,	ابر	—	,,
جولائی	,,	ایک پرندہ اور جگنو۔	—	مخزن
ستمبر	,,	غزل	ع مثالِ پرتوِ مے طوفِ جام کرتے ہیں	دکن ریویو
,,	,,	بچہ اور شمع	—	مخزن
اکتوبر	,,	التجائے مسافر	—	,,
نومبر	,,	کنارِ راوی	—	,,
,,	,,	,,	ع نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیوں کر	وطن اخبار

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
جنوری	۱۹۰۶ء	محبت	—	مخزن
فروری	،،	پیغامِ راز	—	،،
مارچ	،،	حسن اور زوال (حقیقت حسن)	—	،،
اپریل	،،	غزل	ع زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا	،،
،،	،،	،،	ع شمع سے شوقِ اشکباری . . .	،،
ستمبر	،،	صدائے درد	—	تعلیمی جرنل
،،	،،	آفتاب (کانتری)	—	،،
دسمبر	،،	غزل	ع زلفِ دراز حسن بہ یوں طعنہ زن ہوئی	لشتر
،،	،،	غزل	ع چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں	مخزن
جنوری	۱۹۰۷ء	سوامی رام تیرتھ	—	مخزن
فروری	،،	پرندے کی فریاد	—	،،
مارچ	،،	غزل	غ زمانہ آیا ہے بےحجابی کا عام دیدار یار ہوگا	،،
جون	،،	طلبائے علی گڑھ کے نام	—	،،
جون	۱۹۰۷ء	ایک شعر	ع فتنے اٹھتے ہیں کلمتہ اصلاح۔ تیرے کوچے سے سخن	

ماخذ : بحوالہ تلاش و تاثر ، ص ۴۳

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
ستمبر	,,	ترانۂ ہندی	—	اصلاح سخن
ماخذ : ابتدائی کلام اقبال ، ص ۲۲۱				
جنوری	۱۹۰۸ء	غزل	—	آصفیہ امرتسر
اگست	,,	جزیرہ سلسلی (صقلیہ)	—	مخزن
اکتوبر	,,	پیامِ عشق	—	,,
دسمبر	,,	عبدالقادر کے نام	—	,,
جنوری	۱۹۰۹ء	غزل فلاح قوم	ع زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا	صوف جلد I
مارچ	,,		—	کشمیری میگزین
اپریل	,,	بلادِ اسلامیہ		مخزن
جولائی	,,	ستارہ	—	,,
اگست	,,	دو ستارے	—	,,
اکتوبر	,,	رباعیات	آٹھ رباعیات بسلسلہ کشمیر	کشمیری میگزین
ماخذ : [اشاعتِ مکرر]				
اپریل	۱۹۱۰ء	شمع و پروانہ	—	مخزن
جون	,,	شکریہ	—	,,
,,	,,	کورستان شاہی فلسفہ غم	—	,,
جولائی	,,	غزل (؟)	—	نصیح الملک
جولائی/ اگست	,,	ملیحی	بعنوان ''لامکاں کا مکاں''	نظام المشائخ

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۲۷ اگست	”	غم	”فلسفہ غم“	وکیل امرتسر
			ماخذ: بحوالہ اقبال کی تین نظمیں: عبدالقوی دسنوی مشمولہ رسالہ مہر نیم روز اگست ۵۸ء	
ستمبر	”	رات اور شاعر	—	پنجاب ریویو
مئی	۱۹۱۱ء	قطعہ(اصحیت)	ع کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے	مخزن
”	”	ایک شعر	—	ادیب حیدرآباد
جون	”	غزل	ع انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں	”
”	”	شکوہ	—	مخزن
”	”	'سارا جہاں ہمارا'	—	اولڈ بوائے علی گڑھ میگزین
”	”	فلسفہ غم	—	ادیب الہ آباد
			ماخذ: بحوالہ منتخبات نظم اردو مؤلفہ موہن سنگھ دیوانہ مہک اقبال نمبر ۷۷، ص ۱۶۳	
جولائی	”	قطعہ	ع کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبی پہ ۔ ۔ ۔	پنجاب ریویو
”	”	شکوہ	—	”
اکتوبر	”	غرہ شوال	—	مخزن
”	”	عندلیب حجاز کی نذر	—	”

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
,,	,,	حضور رسالت مآب میں	—	زمیندار
اکتوبر	۱۹۱۱ء	حضور نبوی میں خون شہدا کی نذر	—	تمدن
نومبر	,,	,,	—	کشمیری میگزین
,,	,,	قطعہ	ع کل ملا مجھ سے جو صوفی اقبال تو پوچھا میں نے	
,,	,,	اشعار	ع کل ایک شوردیدہ خواب گاہِ نی۔ ۔ ۔	,,
دسمبر	,,	ہمارا تاجدار	—	,,

ماخذ : بحوالہ پنجاب ریویو

۳۴	,, ,,	دعا	—	زمیندار

ماخذ : بحوالہ تلاش و تاثر ، ص ۴۶

,,	,, ,,	,,	—	تمدن
۱۲ جنوری	۱۹۱۲ء	بلادِ اسلامیہ	ع وہ زمیں ہے تو مگر ۔ ۔ ۔ وطن	

ماخذ : [جزوی]

,,	,,	ہمارا تاجدار	(تین اشعار)	مخزن

ماخذ : بحوالہ تبرکاتِ اقبال ، ص ۲۴

,,	,,	نویدِ صبح	—	,,

ماخذ : تلاش و تاثر ، ص ۴۲

,,		دعا	—	,,
مارچ	,,	شکوہ	—	,,

ماخذ : اولڈ بوائے علی گڑھ میگزین ، ص ۵

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۱۱ اپریل	,,	غزل	ع اڑا کے لائی ہے اے صبا تو ۔ ۔ ۔	زمیندار
				ماخذ: تلاش و تاثر، ص ۴۳
,,	,,	شمع و شاعر	—	روداد انجمن
				ماخذ: رسالہ 'اقبال' اقبال نمبر ۷۷، ص ۱۹۸
۲۹	,,	شمع و شاعر	ع آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا	وطن اخبار
				ماخذ: رسالہ 'اقبال' اقبال نمبر ۷۷، ص ۱۹۸
,,	,,	,,	—	تمدن
۱۵ مئی	,,	ترانہ ملی	—	وطن اخبار
				ماخذ: [دو اشعار]
,,	,,	غزل	ع کبھی اے حقیقت منتظر ۔ ۔ ۔	مخزن
,,	,,	شمع	—	,,
,,	,,	بنائے قومیت	ع تو قیس نہیں تو تجھے بن کیا کام	صوفی
جون	,,	نوائے غم	ع زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش	مخزن
,,	,,	خضر راہ کا بند	ع ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں	تمدن
جولائی	,,	مرزا غالب	—	ادیب
دسمبر	,,	جواب شکوہ	—	تمدن

ماخذ: رسالہ امداد مجروحین بلقان منعقدہ ۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
جنوری	۱۹۱۷ء	,,	—	صوفی
فروری	,,	بھول	—	تمدن
۲۵ ,,	,,	,,	—	ہمدرد
,,	,,	گورستانِ شاہی	—	صوفی
مارچ	,,	دردِ عشق	—	العصر لکھنؤ
,,	,,	شفا خانۂ حجاز	—	صوفی
مارچ	۱۹۱۳ء	شفا خانہ حجاز	—	صوفی
مئی	,,	بھول	—	,,
جون	,,	موجِ دریا	—	انسان امرتسر

ماخذ : ابتدائی کلام اقبال ، ص ۲۶۹
اقبالیات کے نقوش ، ص ۶۹۱

,,	,,	چاند	—	صوفی
,,	,,	فاطمہ بنت عبداللہ	—	وکیل امرتسر

ماخذ : بحوالہ عبدالقوی دسنوی مہر لیم روز

,,	,,	,,	—	تمدن
,,	,,	,,	—	مخزن
,,	,,	اسلامی رواداری	—	وکیل امرتسر
,,	,,	فلسفۂ غم	—	,,
جولائی	,,	فاطمہ بنت عبداللہ	—	ہمدرد 'دہلی'

ماخذ : بحوالہ الہلال

اکتوبر	,,	ترانۂ ملی	—	نظام المشائخ
نومبر	,,	مسلم	—	,,

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
دسمبر	،،	نیا شوالہ	—	رسالہ شاہدِ سخن حیدرآباد

ماخذ : بحوالہ ابتدائی کلام اقبال ، ص ۴۲۷

جون	۱۹۱۵ء	نوجوان مسلم سے خطاب	—	صوف ، ص ۳
جولائی	،،	ایک آرزو	(بعنوان کشکول	زمانہ ، ص ۶
،،	،،	دس قطعات	(i) مشرق میں اصولِ دین ان جاتے ہیں	زمانہ کانپور

ماخذ : بحوالہ گیان چند ، شکوہ اقبال نمبر، ص ۳۰

(ii) لڑکیاں پڑھ رہی ہیں
انگریزی

(iii) شیخ صاحب بھی تو
بودے کے کوئی حامی
نہیں

(iv) یہ کوئی دن کی بات
ہے اے مردِ ہوش مند

(v) تعلیم مغربی ہے بہت
جراءت آفریں

(vi) کبھی اچھی نقیب
انجمن سے

(vii) جنابِ شیخ کو ہاواؤ
خاص لندن کی

(viii) تہذیب کے مریض
کو گولی سے فائدہ

(ix) انتہا بھی ہے کوئی
آخر خریدیں کب تلک

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
			(x) ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے	
اکتوبر	۱۹۱۴ء	پیام عشق	—	تمدن
جنوری	۱۹۱۵ء	قطعہ	ع دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک	زمانہ
,,	,,	,,	ع بخت مسلم کی شب تار سے ڈرتی ہے سحر	,,
ماخذ: بحوالہ تبرکات اقبال، ص ۲۵				
فروری	,,	سلیمیٰ	—	صوفی
۱۴ اگست	,,	عید پر شعر لکھنے کی فرمائش پر	—	خطیب دہلی
ماخذ: بحوالہ تلاش و تاثر دسنوی، ص ۴۳				
۲۱ اگست	,,	نظم/قطعہ	—	ذوالقرنین بدایوں
,,	,,	شکوہ	—	ادیب
,,	,,	ہلال عید سے خطاب	—	اخبار کشمیری
۴ ستمبر	,,	عید پر شعر لکھنے کی فرمائش پر	---	پیسہ اخبار
اکتوبر	,,		—	نظام المشائخ
۱۲ نومبر	۱۹۱۵ء	عرفی	محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے	البلاغ

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
،، ،،	،،	غزل	ع سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں	زمانہ
ماخذ: بحوالہ گیان چند ابتدائی کلام، ص ۳۲۶				
جنوری	۱۹۱۶ء	حقیقت حسن	خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا	،،
فروری	،،		—	مخزن
اپریل	،،	،،	قطعہ تاریخ: پیر سید حیدر شاہ جلال پوری	صوفی
مئی	،،	بلال حبشی	روحی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے	،،
۲۲ ،،	،،	غزل	ع کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں	خطیب دہلی
مئی	،،	بلال حبشی	ع لکھا ہے ایک مغربی، حق شناس نے	صوفی
۳۰ ،،	،،	غزل	ع تجھے کیا سنائیں ہم نشیں ہمیں موت میں جو مزہ ...	خطیب دہلی
ماخذ: بحوالہ تلاش و تاثر، ص ۲۸۰				
،،	،،	،،	ع کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں	نظام المشائخ
ماخذ: بحوالہ تلاش و تاثر، ص ۲۸۰				
فروری	۱۹۱۵ء	قطعہ	بجلی کی زد پہ آتے ہیں پہلے وہی طیور	مخزن
ماخذ: تبرکات اقبال، ص ۲۶				

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
فروری/مارچ	,,	غزل	ع پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر	مخزن
,,	,,	,,	—	صوف
,,	,,	,,	شبِ معراج : رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں	,,
مآخذ : عابد رضا بیدار ہم قلم دسمبر ۶۲ء				
اپریل	,,	شیکسپئر	—	مخزن
مئی	,,	غزل	ع لالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی	,,
جون	,,	اشعار	بعنوان 'کچکول' ہے عاشقی کی رسم . . .	,,
,,	,,	,,	آنکھ جو کچھ دیکھتی ستارہ صبح ہے لب پہ آ سکتا نہیں	,,
مآخذ : شمع و شاعر کا ایک شعر				
جولائی	,,	غزل	ع جھلک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں	عصمت
اگست	,,	کلام اقبال	ع لالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی	زمانہ
ستمبر	,,	,,	ع جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی	مخزن
اکتوبر	,,	شبِ معراج	رہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں	صوف
اپریل	۱۹۱۸ء	ایک شعر	علاج درد میں بھی درد کی لذت ہو مرتا ہوں	مخزن
مآخذ : بعنوان کچکول				

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۱۱ مئی	,,	پنجاب کا جواب	اے تاجدارِ خطہ جنت نشان ہند	وکیل امرتسر ، ستارۂ صبح

مآخذ : بحوالہ بیاضِ شیخ اعجاز
بحوالہ ذکر اقبال، ص ۸۷

,,	,,	جنگ اور اہل ہند	—	زمانہ

مآخذ : بحوالہ تبرکات اقبال ، ص ۲۸

جون	,,	'میں اور تو' ع	نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا	معارف

مآخذ : نقوشِ اقبال نمبر ، ، ص ۳۴۸

۶ مئی	,,	پنجاب کا جواب	—	دبدبۂ سکندری رام پور
,, ,,	,,	,,	—	زمانہ
,, ,,	,,		—	حق
,, جولائی	,,		—	ستارۂ صبح
ستمبر ۱۹۱۸ء		ایثار صدیق اکبر	—	کہکشاں

مآخذ : صبا حیدرآباد دکن ، عابد رضا بیدار

اکتوبر	,,	الملک للہ	ہر ملکِ ملک ماست	الناظر

مآخذ : صبا حیدرآباد دکن ، عابد رضا بیدار

,,	,,	ایثار صدیق	—	صوفی

مآخذ : صبا حیدرآباد دکن ، عابد رضا بیدار

دسمبر	,,	عشق اور موت	—	صوفی
۲۱ جنوری ۱۹۱۹ء		نعت	ع لگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر	کشمیری میگزین

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۱ فروری	,,	شعاع آفتاب	—	حق
۷ ,,	,,	,,	—	انتخاب لاجواب
۲۸ ,,	,,	اشعار	ع ہر عمل کے لیے ہے ردِ عمل (مکافاتِ عمل)	,,
ماخذ: بحوالہ مخزن مارچ ۱۹۱۹ء				
,,	,,	مکافات عمل	—	نظام
اپریل	,,	وید منتر کا ترجمہ	—	رسالہ
ماخذ: بحوالہ تبرکات اقبال، ص ۷۵				
۱۱ جولائی	,,	ترانہ اقبال پیام عشق	ع من اے طلب گارِ درد پہلو میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا	انتخاب لاجواب
ستمبر	,,	غزل	ع گرچہ تو زندانیٔ اجباب ہے	صوفی
,,	,,	,,	ع سختیاں کرتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں	,,
۱۷ اکتوبر	,,	پھول	ع تو اپنے پیرہن کے چاک کو پہلے رفو کر لے	انتخاب لاجواب
,,	,,	پولٹیکل گداگری	(دریوزۂ خلافت)	معارف اعظم گڑھ
نومبر	,,	کلام اقبال	خویشوں سے ہو اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو	رسالہ دل نواز ملتان

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
"	"	نعت	نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر	العزیز بٹالہ، ص ۲۹-۳۰
			ماخذ: بحوالہ ماہنامہ نعت، لاہور، ستمبر ۸۸ء	
"	"	سوالی	ع بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے	
		گداگری، دریوزہ خلافت		
جنوری	۱۹۲۰ء	شہباز و شاہیں	ع ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند	نقیب بدایوں
فروری	"	دل	ع مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند	صوفی عرس نمبر ص ۱۳
۱۵ اپریل	"	ارتقا	ع ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز	پیسہ اخبار
			ماخذ: بحوالہ ذکر اقبال، ص ۱۰۹	
۲۵ مئی/ جون	"	کلام اقبال	(i) ستیزہ کار رہا ہے . . . (ارتقا)	
			(ii) ہر زائر چمن سے ۳۴	
			(iii) اخبار میں یہ لکھتا ہے لندن کا پادری . . .	صوفی
جون	"	شعاعِ آفتاب	—	زمانہ کانپور
جولائی	"	اشعار مزاحیہ	ع ہے قوم سلطنت . . .	"

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
اگست	,,	والدہ مرحومہ کی یاد میں	—	صوفی
اکتوبر	,,	قطعہ	ع آساں ہے اب تو ہند و مسلم کا اتحاد	سخن سنج لکھنؤ
,, نومبر	۱۹۲۱ء	برگِ گل	—	رسالہ پیر بھائی، دہلی
ماخذ: بحوالہ صدیقی جدید اقبال پر تحقیقی مطالعے، ص ۹				
۹ ,,	,,	صدائے ایک	ع لندن کے چرغ نادر فن سے پہاڑ پر	زمیندار
ماخذ: بحوالہ بیاض شیخ اعجاز احمد				
۱۳/۲۵ نومبر	,,	قطعہ (مزاحیہ)	ع گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی	,,
ماخذ: بحوالہ بیاض شیخ اعجاز احمد				
۲۱ ,,	,,	نظم	—	,,
ماخذ: بحوالہ سرگذشت اقبال، ص ۱۵۰				
۱۸ نومبر	,,	ماران غوک خور		زمیندار
ماخذ: بحوالہ شیخ اعجاز احمد				
دسمبر	,,	ماران غوک خور	—	صوفی
	,,	سرمایہ داروں کا تکیہ	ع سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں	,,
	,,	اشکریا جوج جوج	ع محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے	,,
	,,	چورن	ع شام کی سرحد سے رخصت ہے وہ رندِ لم یزل	,,

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
جنوری	۱۹۲۲ء	قطع (ہمایوں)	—	ہمایوں شمارہ اول
		ماخذ : بحوالہ صبا حیدرآباد دکن		
مارچ	،،	خاموشی/ ایک شام	—	،،
		ماخذ : بحوالہ عبدالمجید سالک ، اکبر حیدری		
اپریل	،،	ظریفانہ اشعار	—	زمیندار
،،	،،	خضرِ راہ	—	روداد انجمن
۲۶ ،،	،،	حقائق و معارف (مالوی)	—	زمیندار
		ماخذ : بحوالہ بیاض شیخ اعجاز		
مئی	،،	خضرِ راہ (نامکمل)	—	صوفی
نومبر	،،	پیام صبح	ع اجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب . . .	،،
،،	،،	ستارہ	—	
فروری	۱۹۲۳ء	لکنے	(i) عمل عاشقوں کے ہیں بے طور سارے	صوفی
			(ii) ہند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرلگ	
		ماخذ : بحوالہ اکبر حیدری		
مارچ	۱۹۲۳ء	طلوع اسلام	—	جامعہ علی گڑھ
۱۹ اپریل	،،	،،	—	پیسہ اخبار
۶ ،،	،،	،،	(دو ہند)	زمیندار

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
،،	،،	،،	—	صوفی
،،	،،	،،	—	کریسنٹ اسلامیہ کالج میگزین
ماخذ : بحوالہ اقبال ریویو ، جولائی ۸۷ء ، ص ۵۴				
،،	،،	غزل	ع نہ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا	،،
جولائی	،،	موت اور زندگی کی حقیقت	ع آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی	صوفی
ستمبر	،،	شیکسپئر	—	،،
۱۲ دسمبر	،،	اشعار (طلوع اسلام) کا ایک بند	ع غلامی میں نہ کام آتی ہیں . . .	پیسہ اخبار
جنوری	۱۹۲۴ء	نوائے اقبال	ع نہ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا	صوفی
۲۱ اگست	،،	غزل	ع زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا	اخبار کشمیری
۲۰ نومبر	،،	کرم اے شہ عرب و عجم	ع نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا	پیسہ اخبار
دسمبر	،،	تنہائی	—	زمانہ
مارچ	۱۹۲۵ء	غزل	—	کشاف امرتسر
،، اپریل	،،	خوابگاہِ مصطفیٰ	(بلادِ اسلامیہ کا آخری باب)	نیرنگِ خیال

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۲۸ جون	،،	ایک پرندے کی فریاد	—	پیسہ اخبار
۲۸ اگست	،،	(طلوع اسلام)	تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا	،،
اکتوبر	،،	ہستی بے تاب	(عاشق ہرجائی)	صوفی
۵ نومبر	،،	ابر گہر بار (ایک بند)	ع میں وہ مضمون ہوں کہ مشکل ہے سمجھنا میرا	پیسہ اخبار
۷ دسمبر	،،	حقیقت منتظر	ع کبھی اے حقیقت منتظر	،،
،،	،،	اسرار محبت		نیرنگ خیال
،،	،،	فکر وطن	(i) نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو	زمانہ
				ماخذ: [تصویر درد]
			(ii) خوشیوں سے نہ اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو	زمانہ
				ماخذ: [ایک وید منتر]
،،	،،	ہستی بے تاب	ع عین شغل ہے مجھے پیشانی چاہیوں تری ہے سجدہ راز	
				ماخذ: [عاشق ہرجائی]
فروری	۱۹۲۹ء	مزاحیہ قطعات	(i) شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں	انقلاب
			(ii) دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانہ میں	،،

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
			(iii) تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ	انقلاب
			(iv) ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے	,,
مارچ/اپریل	,,	چاند	بانگ درا کا ایک ورق	نیرنگِ خیال
۱۵	,,	پیغام عمل (پھول)	ع تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاک بلبل کی	ہمدم اخبار
اگست	,,	قطعہ اقبال	ع مسلم کی نبض دیکھ کے کہنے لگا طبیب	صوفی
جنوری	۱۹۲۷ء	عشق اور موت	—	نیرنگِ خیال
فروری	,,	ہلال عید	—	نظام المشائخ
مئی	,,	مسلم	—	,,
۲۱/۲۰ دسمبر	,,	نظم	ع یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے	اخبار کشمیری
,,	,,	ساقی نامہ (چار اشعار)	بعنوان 'عشق کی آگ'	فردوس
۲۰	,,	,,	بعنوان پیغام سروش	صوفی
,,	۱۹۲۸ء	اشعار	ع یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے	نیرنگ خیال سالنامہ
,,	,,	ساقی نامہ	بند نمبر ۲	تنظیم امرتسر
,,	,,	,,	بعنوان زندگی	ہمایوں
,,	,,	,,	ع رہی زندگی موت کے گھات میں	صوفی

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
،، اپریل	،،	،،	—	زمانہ

مآخذ : بحوالہ عابد رضا بیدار
صبا حیدرآباد دکن مارچ ۶۱ء

اگست	،،	غزل	ع لالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی	زمانہ
اکتوبر/ نومبر	،،	رام	—	نیرنگ خیال رامائن نمبر
۱۳ دسمبر	،،	فلسفہ موت	ع مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں	ہفت روزہ اخبار

مآخذ : بحوالہ باقیات اقبال ، طبع سوم ، ص ۵۳۵

،،	،،	پیغام سروش	ع تمدن ، تصوف ، شریعت ، کلام	فردوس
،، جنوری	۱۹۳۰ء	خطاب بہ نوجوانان اسلام	—	ادبی دنیا
۲۰ ،،	،،	،،	جسے مرنا نہیں آتا اُسے جینا نہیں آتا	کشمیری میگزین
فروری	،،	کنارِ راوی	تصویر درد	ادبی دنیا
۲۶ جون	،،	(تصویر درد)	جسے مرنا نہیں آتا اُسے جینا نہیں آتا	ہفت روزہ اخبار
اکتوبر	۱۹۳۰ء	دو اشعار	ع مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا	رسالہ تاج
دسمبر	۱۹۷۱ء	میں اور مری قوم	ع ہو چکا اے قوم تیرا آشیاں برباد اب	علم مجلسی

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
سالنامہ	۱۹۳۲ء	,,	ع ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دہر تمام	نیرنگ خیال
			مآخذ: بحوالہ عابد رضا بیدار، ہم قلم	
۲۵ فروری	,,	,,	ع مے ہی کے تھوڑی سی مخمور رہنا	ہفتہ اخبار
مئی	,,	تصویر درد کا ایک باب	—	نیرنگ خیال
جولائی	,,	,,	ع نظر اس دور میں مجھ کو ترا جچنا نہیں آتا	مولوی دہلی ۱۳۵۱ھ ربیع الاول
سالنامہ	۱۹۳۳ء	بادۂ شبانہ	ع اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں	کاروان
فروری	,,	,,	—	فالوس
,,	,,	,,	—	فردوس
مئی	,,	الہام اقبال	[مسجد قرطبہ کا ایک بند]:	جامعہ
			ع دیکھ چکا المنی...	
دسمبر	,,	دین و سیاست	—	نیرنگ خیال
			مآخذ: سالنامہ ۳۳ء	
جنوری	۱۹۳۳ء	,,	—	نظام المشائخ صوفی
,,	,,	دو اشعار	ع یقیں اللہ مستی خود گزینی	علی گڑھ، میگزین
سالنامہ	,,	دربار بہاولپور	—	نیرنگ خیال

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار رسالہ
اپریل	,,	مسلمانوں کی میراث	نظم فقر ماخذ: کلیات ، ص ۵۲۴	پیشوا
مئی	,,	دین و سیاست	—	,,
		ایک شعر	ع آنکھیں تو ہو جاتی ہیں ہر کہیں لذت اس افسانے میں	سالک پنڈی
			جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا	,,
نومبر	,,	بادۂ شبانہ	ع ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دہر تمام	صوفی
مئی	,,	دعا (مسجد قرطبہ)	—	تاج ، لاہور
,,	,,	لینن خدا کے حضور	—	ہمایوں
,,	,,	مرزا غالب	—	,,
جولائی	,,	طارق کی دعا	—	تاج ، لاہور
اکتوبر	,,	افکارِ عالیہ	. . . مقام آیا غزل	,,
۲۸ نومبر	,,	مدنیت اسلام	—	انقلاب
مآخذ: بحوالہ فردوس				
مارچ	۱۹۲۶ء	شاعر	—	طلوعِ اسلام
۵ جون	,,	ایک نوجوان کے نام	(i) ترے صوفے ہیں افرنگی . . .	اجتماع دہلی
			(ii) عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں	,,
,,	,,	نغمہ سرمدی (لا الا اللہ)	خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ	نظام المشائخ

ماہ	سال	عنوان	غزلوں اور قطعات کے پہلے مصرعے	اخبار/رسالہ
۹ اگست	,,	ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام	—	انقلاب
,,	۱۹۳۷ء	وائسرائے کا دربار	کیا خوب یہ عالم ہے ادھر مد ہے اُدھر جذر	سالنامہ احسان
۱۶ جنوری	,,	اقبال کا غلاموں سے خطاب	—	اخبار ایمان
اکتوبر	,,	امامت	—	,,
,,	,,	مسعود مرحوم	—	رسالہ حیدرآباد دکن
۱۴ جنوری ۱۹۳۸ء		,,	—	انقلاب

مآخذ : بحوالہ اقبال نامہ ، جلد اول ، ص ۳۳۰

۳ فروری	,,	حسین احمد	—	,,
۲۲ فروری	,,	مسعود مرحوم	—	ندیم بھوپال
,, مئی	,,	قطعہ	اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا	زمانہ

مآخذ : [قطعہ بانگ درا ، ص ۲۸۲]

کتابوں پر تبصرے

اقبالیات مہر

مصنف : مولانا غلام رسول مہر
مرتب : امجد سلیم علوی
ناشر : مہر منز (پرائیویٹ) لمٹیڈ
: ۱۳ - سلام سٹریٹ مسلم ٹاؤن ، لاہور
صفحات : ۲۶۹
قیمت : ۱۰۰ روپے

(۱)

مولانا غلام رسول مہر مرحوم ہمارے ان بزرگوں میں سے تھے جنھیں علم و ادب کا سرچشمہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ ان کی تحریر و تقریر کے زلال شیریں سے تشنگانِ حکمت و آگہی پہلے بھی تسکین پاتے رہے ہیں اور آیندہ بھی اس صدقۂ جاریہ کا روز افزوں فیضان علم و ادب کے متلاشیوں تک پہنچتا رہے گا ۔

حضرت علامہ اقبالؒ سے مولانا مہر کا نیاز و ارتباط کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ وہ خود فرماتے ہیں :

> ”جس حد تک مجھے یاد ہے زندگی میں کسی بلند منزلت ہستی کے ساتھ اتنا وقت گذارنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی جتنا وقت حضرت علامہؒ مرحوم کے پاس گذرا“۔

آپ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک تقریباً روزانہ اور حیاتِ اقبال کے باقی برسوں میں بھی بکثرت حضرت علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کرتے رہے ۔ نیاز مندی اور ہمنشینی کے اس طویل عرصے میں مولانا مہر نے حضرت علامہؒ سے جو کسب فیض کیا اُن کے شواہد اُن کی تحریروں

میں بالخصوص نظر آتے ہیں جو انھوں نے حضرت علامہؒ کے سلسلے میں سپردِ قلم کیں ۔ متفرق مضامین کے علاوہ مطالبِ بانگ درا ، مطالب بالِ جبریل مطالب ضربِ کلیم ، مطالب اسرار و رموز ، مرورِ رفتہ اور اس کا دیباچہ ، حضرت اقبالؒ کی تفہیم اور فیضانِ اقبالؒ کی تعمیم کے سلسلے میں مینارِ ادب ہیں ۔

حضرت علامہ اقبال کے بارے میں مولانا مہر کے متعدد مضامین کتب و جرائد میں بکھرے ہوئے تھے ۔ ضرورت تھی کہ ان تحریروں کو یکجا کیا جائے تا کہ ایک ثقہ اور معتبر متخصصِ اقبالیات کے رشحاتِ فکر کی روشنی میں مطالعۂ اقبالیات کا ایک اور باب وا ہو سکے ۔ اس اہم ادبی ضرورت کو پورا کرنے کا سہرا مولانا مہر مرحوم ہی کے چھوٹے بیٹے جناب امجد سلیم علوی کے سر ہے ۔

''اقبالیات'' میں کل اکیس ابواب ہیں ان میں سے دو مضامین غیر مطبوعہ ہیں یعنی 'علامہ سے تعارف' ، اور اقبال روز نامچۂ مہر ہیں ، ۔ باقی مضامین میں سے بیشتر اہم اخبارات و جرائد مثلاً زمیندار ، انقلاب ، چٹان ، لیل و نہار ، اقبال ریویو ، حمایتِ اسلام ، اوراق وغیرہ میں شائع ہوئے ۔ مطالب اسرار و رموز ، سرودِ رفتہ، مکاتیب اقبال بنام گرامی اور اقبال درونِ خانہ کے مقدمے بھی اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں ۔ اقبال کے فکر و اسلوب کو سمجھنے میں یہ کتاب بہت ممدود معاون ثابت ہوگی ۔ اس میں کہیں اقبال کے متفرق اشعار کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے ، کہیں نظموں اور اشعار کا پس منظر پیش کیا گیا ہے ، کہیں متن اقبال کو صحت کے ساتھ پیش کرنے کی تلقین اور کوشش ملتی ہے ، کہیں اقبال کی معاصر شخصیات کے بارے میں معلومات اور اطلاعات ہیں ، کہیں حضرتِ علامہ کی معاصر ادبی و سیاسی تحریکوں پر تبصرے ہیں اور یہ سب ایسے پرتاثیر ، دلکش اور جمال افروز پیرائے میں ہے جس پر روح ادب ہمیشہ ناز کرے گی ۔ پھر اس کتاب میں مولانا مہر کی دل سوزی ، درد مندی اور اخلاص کیشی کی روشنی صفحے صفحے پر پھیلی ہوئی ہے ۔ مثال کے طور پر ایک مضمون '' اقبال اور تربیت عوام '' سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

> '' میرے اندازے کے مطابق اقبالؒ نے تعلیم و تربیت عوام کے سلسلے میں جو کچھ کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اولاً براہِ راست قرآنی تعلیم

سے ماخوذ ہے، ثالیاً ملت کی صحیح تعمیر ان اصولوں کے سوا ہو ہی نہیں سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم سالہا سال سے جو کوششیں اور کاوشیں کر رہے ہیں ، ان کی ناتمامی اور حسرت انجامی کا اصل راز یہی ہے کہ ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں ، اس کے لیے صحیح طریقِ عمل اختیار نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے چند جملے رٹ لیے ہیں جنھیں مختلف مجالس و مجامع میں چند روز کے لیے بار بار دہراتے رہتے ہیں لیکن جب تک ان کلموں کی معنویت اپنے اوپر طاری نہ کر لیں مطلوبہ نتیجہ کیونکر پیدا ہو سکتا ہے ؟ اگر کوئی طبیب یا ڈاکٹر کسی مریض کا معائنہ کر کے نسخہ لکھ دے تو کیا وہ نسخہ مریض کو سناتے رہنے سے مرض دور ہو جائے گا ؟ اگر آپ لاہور سے پشاور یا پشاور سے کراچی جانے کے آرزو مند ہیں تو کیا ریلوے کے ٹائم ٹیبل کا متعلقہ حصہ یا ہی آئی اے کی پرواز کا پروگرام پڑھتے رہنے سے منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے ؟ اگر آپ بھوکے ہیں تو اشیائے خورد و نوش کے نرخ نامے دیکھ دیکھ کر بھوک کے ازالے کی امید پوری ہو جائے گی ؟ اصل شے یہ ہے کہ مقاصد کے مطابق عمل پر خاص توجہ کی جائے ۔ اگر ہمارا عقیدہ واقعی یہ ہے کہ ہماری دنیوی اور اخروی فلاح کا انحصار صرف اسلام کے پیش کیے ہوئے نقشۂ عمل پر ہے تو سوچئے کہ ہم نے اب تک قوم کو اسلام کے مطابق کاربند بنانے کے لیے کیا کچھ کیا اور اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔"

کتاب کی ترتیب اور طباعت کے امور پر مناسب توجہ دی گئی ہے تاہم بعض مقامات محلِ نظر معلوم ہوتے ہیں ۔ مثلاً ۲۱ اپریل ۱۹۵۸ء سے چٹان میں "علامہ اقبال کا نظریۂ حدیث" کے عنوان سے دیگر اصحابِ علم و ادب کے ساتھ مولانا مہر کا ایک مکتوب بھی شائع ہوا تھا ۔ اس مکتوب کو کتاب میں نقل کرتے ہوئے عنوان کو سہواً "علامہ اقبال کا نظریۂ حیات" لکھا گیا ہے ۔ اسی مکتوب میں ایک اقتباس یہ ہے :

"اس مدت کے جتنے اوقات ان کی خدمت میں بسر کیے ، وہ آج تک کسی دوسری بزرگ ہستی کے ساتھ بسر نہیں ہوئے ۔"

زیرِ نظر کتاب میں "بزرگ ہستی" سے پہلے کا لفظ "دوسری" سہواً

خذف ہو گیا ہے۔ اسی مکتوب میں یہ فقرہ بھی ہے ”جیراج پوری اور پرویزی مکاتب فکر کے در و دیوار سے یہ صدائیں اٹھ رہی ہیں۔“ زیر نظر کتاب میں ”در و دیوار“ کو ”درد کی دیوار“ بنا دیا گیا ہے، جو ظاہر ہے درست نہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے:

وسعتِ سعیٔ کرم دیکھ کہ سر تا سرِ خاک
گذرے ہے آبلہ پا، ابرِ گہر بار ہنوز!

زیر نظر کتاب کے ص ۲۱ پر یہ شعر نقل کرتے ہوئے پہلے مصرع میں ”کہ“ کو ”کر“ اور ”سرتا سرِ خاک“ بنا دیا گیا ہے۔

ان چند محدود تسامحات سے قطع نظر مولانا مہر کی یہ تازہ وارد تصنیف ”اقبالیات“، اقبالیاتی ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے اور اس کے مرتب جناب امجد سلیم علوی اقبالین کے جذباتِ تشکر کے مستحق ہیں۔

(جعفر بلوچ)

(۲)

مولانا غلام رسول مہر آن ماہرین اقبالیات سے ایک بالکل مختلف شخصیت ہیں جنہوں نے اقبال کو کتابوں کے متن سے پڑھا اور اپنے مخصوص زاویوں سے اقبال کی تشریح و تعبیر کرنے کی کوشش کی۔ مولانا غلام رسول مہر خدمت اقبال میں حاضر رہنے اور ان سے مستقل فیض پانے والے لوگوں میں تھے، اقبال ان کے نزدیک موضوع نہیں تھا ان کی ادبی ترایت کا حصہ تھا۔ علامہ اقبال کو مہر صاحب کی ذات پر اتنا اعتماد تھا کہ شام کی مجلس میں انہیں تازہ نظمیں سناتے، ان کے مطالب و مفاہیم اور منظر و پس منظر کا ذکر کرتے اور گفتگو میں فعال سیاسی شخصیات کا ذکر آ جاتا تو رائے کا اظہار بر ملا کر دیتے۔ مہر صاحب رات کے گیارہ بجے گھر پہنچتے تو اس شام کی یاد داشتیں کاپی میں لکھ لیتے۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۵ء میں شروع ہوا اور وقفوں کے باوجود خاصی مدت تک جاری رہا۔ مہر صاحب کی ان کاپیوں سے ”زبورِ عجم“ کے متعدد اشعار کا یومِ تخلیق متعین کیا جا سکتا ہے اور مہر صاحب کا منفرد اعزاز یہ ہے کہ وہ رسمی اقبال شناس نہیں بلکہ ماخذِ اقبال کی حیثیت بھی رکھتے

تھے اور اقبالیات کے موضوع پر لکھتے ہیں وہ ان مطالب و معانی کو بھی منکشف کرتے تھے جو انھوں نے زبانِ اقبال سے سنے تھے ۔ مولانا مہر کی تازہ ترین کتاب اقبالیات جسے امجد سلیم علوی صاحب نے مہر صاحب کے گم شدہ اوراق سے تلاش بسیار کے بعد مرتب کیا ہے اسی وجہ سے اہم ہے کہ اس میں اقبال کے حضور میں حاضر رہنے والے ایک مخلص اقبال دوست کے مضامین منظرِ عام پر آ گئے ہیں اور ان سے فکر و فنِ اقبال کے علاوہ اقبال کی شخصیت کے لئے زاویے بھی سامنے آ جاتے ہیں ۔

"اقبالیات" میں شامل ۲۱ مضامین کو ہم بآسانی چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ، ایک حصہ شخصیت کے مضامین پر مشتمل ہے ۔ ان میں علامہ اقبال سے تعارف ، علامہ اقبال کی زندگی کا آخری دور—اقبال روز نامچہ مہر میں اور اقبال دیارِ مغرب میں—کو شامل کیا جا سکتا ہے ۔ ان مضامین میں ہمارے سامنے وہ اقبال آتا ہے جسے مولانا مہر نے بچشم خود دیکھا تھا اور جو اقبال کے بہت سے حیات نگاروں سے اب بھی پوشیدہ ہے ۔ خوبی کی بات یہ کہ مہر صاحب نے صرف واقعہ نگاری نہیں کی بلکہ ایسے نکات بھی بیان کر دیے ہیں جو انھوں نے مجالسِ اقبال سے جمع کیے تھے ۔ مثال کے طور پر کان پور کے ایک شاعر کی نظموں نے زمیندار اخبار میں اہل ذوق پر جو "قیامت" برپا کر رکھی تھی ، اس کا اثر اقبال نے جداگانہ قبول کیا تھا ۔ مہر صاحب اسی واقعے کے ذکر میں لکھتے ہیں :

> "صحن میں ظفر علی خان بیٹھے تھے ۔ مغرب کی نماز ہو چکی تھی ، عشاء کی اذان ابھی نہیں ہوئی تھی ، مولانا سے تھوڑے فاصلے پر اقبال بھی تشریف فرما تھے ۔ گرمی کا موسم تھا ، اقبال نے شلوار پہن رکھی تھی ، سفید قمیض ۔ اوپر چھوٹا کوٹ ، سر پر لنگی بندھی تھی ۔ ہاتھ میں چھڑی تھی ، اس زمانے میں وہ انارکلی میں رہتے تھے ، میرا خیال ہے کہ شام کے وقت ٹہلتے ٹہلتے مولانا ظفر علی خان سے ملنے آ گئے تھے ۔"

ہمارے سامنے انھوں نے جو کچھ فرمایا یہ تھا کہ :

> "ظفر علی خان آپ کے اخبار میں کان پور کے فلاں صاحب کی جو لمبی لمبی نظمیں چھپتی ہیں بعض اوقات خیال آتا ہے کہ تھرڈ کلاس

کا ٹکٹ لوں اور کالہور پہنچ کر ان کے پیٹ میں چھرا گھونپ
دوں ۔ پھر سوچتا ہوں کہ اس شخص کو ختم کرنے کے لیے
کان پور تک تھرڈ کلاس کا کرایہ خرچ کرنا بھی روپے کا ضیاع ہوگا۔"

مولانا مہر نے لکھا ہے کہ "حضرت علامہ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ اس قسم کی نظمیں اخبار میں نہ چھپنی چاہییں" لیکن بالواسطہ طور پر یہ بھی باور کرا دیا ہے کہ اس زمانے میں خبریں اور مضمون زیادہ نہیں ہوتے تھے اور اخبار نویس کا اولیں مقصد یہ ہوتا تھا کہ اخبار کے صفحات جلد سے جلد پر ہو جائیں ۔ اس لیے شاعروں کی معمولی نظموں کو بھی جگہ مل جاتی تھی اور عموماً "زمیندار" کا پورا صفحہ گھیر لیتی تھیں ۔

کتاب کا دوسرا حصہ اقبال کی تعلیمات اور نظریات پر روشنی ڈالتا ہے ۔ "علامہ اقبال اور تربیتِ عوام"—"علامہ اقبال کا نظریۂ حیات"—"اقبال اور افریقہ کی آزادی"—جیسے مضامین اس ذیل میں بآسانی رکھے جا سکتے ہیں ۔ لیکن یہاں بھی مولانا مہر نے نظریاتی توضیح کے بجائے بعض مسائل پر اقبال کے فرمودات سے شہادت فراہم کرنے کی سعی ہی کی ہے ۔ مثال کے طور پر جب شورش کاشمیری کے رسالہ چٹان میں چراغ پوری اور پرویزی مکاتبِ فکر کی یہ آواز ابھری کہ "علامہ اقبال احادیثِ رسول ؐ کو تاریخ اور معاملات سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے"۔

تو مولانا مہر نے فرمایا :

> "میں نے سولہ برس کی مدت میں حضرت علامہ مرحوم کی زبان سے کبھی ایسی بات نہیں سنی جس سے یہ سمجھا جا سکتا کہ احادیث کے بارے میں ان کا عقیدہ عام مسلمانوں کے عقیدے سے متفاوت ہے ۔ ان کی گفتگوؤں سے یہی سمجھتا رہا کہ وہ احادیث کی دینی حیثیت کے معتقد ہیں۔"

مہر صاحب کی کتاب اس قسم کے بیاناتِ واقعہ سے اس گرد کو صاف کرنے میں مدد دیتی ہے جو اقبال کے بارے میں ایک خاص گروہ نے ان کی وفات کے بعد اڑانے کی کوشش کی تھی ۔

کتاب کا تیسرا حصہ کتبِ اقبال کی توضیح اور چوتھا حصہ شخصیاتِ

عہد اقبال جن میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا گرامی کو اہمیت حاصل ہے ان دونوں حصوں میں بھی مہر صاحب نے زیادہ تر شخصی شہادت فراہم کرنے اور واقعات عہد اقبال کو صحت سے بیان کرنے کی کاوش کی ہے۔ اس کی ایک دلچسپ صورت ''علامہ اقبال اور مولانا آزاد'' کے موضوع پر دو مضامین سے سامنے آتی ہے۔ اعتراض یہ اٹھایا گیا کہ مولانا آزاد نے سینکڑوں شعر اپنی تحریروں میں نقل کیے ہیں مگر تعجب ہے کہ انھوں نے علامہ کا کوئی شعر کبھی نقل نہیں کیا؟'' مہر صاحب نے مولانا آزاد کی حمایت کی ہے اور نہ اقبال کی عظمت کو سوال بنایا ہے بلکہ ان دو مضامین میں نابغہ روزگار شخصیتوں کے روابط کا ذکر اس انداز میں کیا ہے کہ حسنِ عمل اور لیک نیتی کا ایک واضح نقش ابھر کر سامنے آ جاتا ہے اور حقیقت بانداز دگر منکشف ہو جاتی ہے۔

مہر صاحب کی یہ کتاب دیدہ اور شنیدہ قسم کے واقعات پر مشتمل ہے لیکن کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ عقیدت نے غلو کی صورت اختیار کی ہے اور ممدوح کو بروزِ قلم آفاقی شخصیت بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مولانا مہر نے اقبال کو ایک انسان کی سطح سے دیکھا، جانچا اور پرکھا ہے اور ہمدردی اور محبت سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں اگر کمی محسوس ہوئی ہے تو یہ کہ مہر صاحب نے توضیح و شرحِ شعر میں پوری توجہ صرف نہیں کی۔ انھوں نے جس عالمانہ شان سے اقبال کے اس شعر:

''ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کی وضاحت کی ہے اسے پڑھ کر آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کاش مولانا مہر اسی طرح مزید اشعار کی توضیح کرتے لیکن موت نے انھیں مہلت نہ دی۔ اس کمی کے باوجود ''اقبالیاتِ مہر'' ایک قیمتی کتاب ہے اور یہ اقبال کی تفہیم اور ان کی شخصیت نگاری کے لیے بنیادی مواد فراہم کرتی ہے۔

(ڈاکٹر انور سدید)

(۳)

اقبال پر ہمہ جہتی مذاکرہ

مرتبہ : ڈاکٹر محمد حسن
قیمت : دس روپے ، شعبۂ اشاعت
جواہر لال نہرو یونیورسٹی ، دہلی

۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کا سو سالہ جشن پیدائش منایا گیا تو اس سلسلے کی ایک باوقار تقریب جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی میں بھی منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں اردو ادب کے ماہرین کے علاوہ دوسرے سماجی علوم کے ماہرین نے بھی اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اقبال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس مذاکرے میں جو مقالات پڑھے گئے ان کا ایک جامع انتخاب ڈاکٹر محمد حسن نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ :

> ''اقبال دورِ حاضر کی عہد ساز شخصیتوں میں ہیں ، انھوں نے محض اردو اور فارسی شاعری ہی کو نیا فکری اور فنی آہنگ نہیں بخشا بلکہ مختلف علوم و فنون میں ان کے نقوشِ قدم نے نئی راہوں کی نشان دہی کی ''

زیر نظر کتاب میں اقبال کو شعر و ادب کے حوالے سے بھی پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان علوم و فنون کو بھی مرکزِ نگاہ بنایا گیا ہے جو اقبال کے افکار و اقدار کی آماجگاہ تھے۔ مثال کے طور پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے '' اقبال کے تصور اسلام'' پر اور ڈاکٹر یوسف حسین خان نے ''اقبال اور نظامِ معشیت'' پر مقالہ لکھا ہے ۔ ڈاکٹر محمد حسن نے سائنس اور مذہب کے حوالے سے اور نصیر احمد خاں نے ساقی نامہ کے حوالے سے اقبال کے شعری اسلوب کا جائزہ لیا ہے اور روش عام سے ہٹ کر نتائج نکالے ہیں ۔ پاکستانی مقالہ نگاروں میں سے ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ '' کیا اقبال آفاقی شاعر ہیں '' اس کتاب میں شامل ہے ۔ چنانچہ اس کتاب کا تنوع بھی متاثر کرتا ہے اور استدلال کی شائستہ مزاجی بھی توجہ کھینچتی ہے ۔

(ڈاکٹر انور سدید)

(۴)

اقبال ، ایک مطالعہ

مصنف : ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
ناشر : اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور
ضخامت : ۲۸۰ صفحات
قیمت : ۶۵ روپے

علامہ اقبال کے فکر و فن پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اردو کے مجموعی ذخیرۂ تنقید و تحقیق میں کسی ایک موضوع پر اتنا وسیع تحریری سرمایہ یقینی طور پر موجود نہیں ۔ اس صورت حال کو عموماً موضوع کی پامالی سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس سے اقبالیات کے روز افزوں امکانات کا پہلو بھی تو نکلتا ہے یعنی ایک طرف موضوع "پامال" ہو رہا ہے اور ساتھ ہی :

ع کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

سال بہ سال اقبالیات کے ذخیرے میں بکثرت اور متنوع اضافہ بھی ہو رہا ہے اور اسی میں کبھی کبھی ایسی چیزیں بھی سامنے آتی ہیں ، جو رسمی اور روایتی تحریروں سے مختلف ہونے کی بناء پر توجہ اپنی جانب کھینچتی ہیں ۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مجموعۂ مضامین "اقبال ، ایک مطالعہ" سے تنقید اقبالیات کے تنوع ، افادیت اور ساتھ ہی اس کے امکانات کا احساس ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر ذوالفقار اس سے پہلے زبان و ادب کے مختلف موضوعات پر متعدد تحقیقی اور تنقیدی کتابیں پیش کر چکے ہیں اور ان دنوں استنبول میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کی درس و تدریس میں مصروف ہیں ۔ زیر نظر کتاب ، اقبالیات پر ان کی تحقیق و تدقیق کا حاصل ہے اقبال "عصر نو کا پیامبر" غالباً صاحب موصوف کا پہلا مضمون ہے ۔ جو نومبر ۱۹۵۹ء کے "محور" میں شائع ہوا تھا ، اور "اقبال کے عمرانی تصورات" آخری مضمون ہے جو "مجلہ تحقیق" (Research) میں شائع ہوا (ہر مضمون کا زمانۂ تحریر بھی درج کرایا جاتا تو بہتر تھا) ۔ ربع صدی سے زائد عرصے پر پھیلے ہوئے ان مضامین میں بہ لحاظ موضوع اور بہ لحاظ نوعیت بھی خاصا

تنوع ملتا ہے - چند مضامین خالص تحقیقی نوعیت کے ہیں - مثلاً : ''اقبال کا تعلق اورینٹل کالج سے'' سلسلۂ سوانح اقبال ، ایک خالصتاً تحقیقی کاوش ہے - یہ مضمون کئی سال پہلے لکھا گیا تھا - ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے نئی معلومات کی روشنی میں اس میں ترامیم کیں اور بصورتِ موجودہ ، یہ حوالے کا ایسا مضمون بن گیا کہ اقبال کے تقریباً تمام سوانح نگاروں نے اس سے استفادہ کیا ہے اور آیندہ بھی حیات اقبال پر لکھنے والوں کے لیے اس سے صرف نظر ممکن نہیں ہوگا - ''اقبال کے ایک پیرو مرشد اکبر الہ آبادی'' ایک اور وقیع مضمون ہے ، جس میں انھوں نے بڑی کاوش سے اکبر و اقبال کے باہمی روابط ، ذہنی فاصلوں ، فکری ہم آہنگی اور فنی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اکبر و اقبال کے بہت کچھ موضوعات مشترک ہونے کے باوجود ، دونوں کا اسلوبِ شعری منفرد اور جدا ہے - اُن کے بقول :

> '' اکبر کا اسلوب شعری طنز و ظرافت کی چاشنی اور اُن کے مخصوص علائم و رموز سے مل کر مشرق شاعری میں ایک منفرد رنگ اختیار کر چکا تھا - اقبال کا رنگِ سخن فکر و فن کے اعتبار سے ایک نئے دبستان کی طرح ڈال رہا تھا۔''

'' اقبال کا اسلوب نگارش'' میں انھوں نے ایک ایسے موضوع پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے ، جس پر اقبالی نقادوں نے بالعموم توجہ نہیں دی - مصنف نے اردو نثر کی تاریخ میں نثرِ اقبال کی ماہیت اور قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے - بلاشبہ ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے نثری ذخیرے کا بڑی کاوش کے ساتھ گہرا مطالعہ کیا ہے اور اردو کے نثری اسالیب کے تسلسل میں اقبال کی اردو نثر کے لب و لہجے اور ذائقے کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے - اُن کا یہ کہنا بجا ہے کہ اقبال کی تحریروں کو پڑھ کر قاری کا ذہن ایک لحظے کے لیے بھی اسلوب کی بھول بھلیوں میں نہیں الجھتا ، نہ کہیں مطالب سے جدا ہوتا ہے ، مگر اُن کے اس نتیجۂ تحقیق سے اتفاق مشکل ہے کہ : '' اقبال ایک صاحب طرز اسلوب نگار ہیں۔'' دراصل اقبال کی نثر میں اس قدر تنوع ہے اور حکیمانہ اور ادیبانہ زندہ دلی اور بذلہ سنجی اور رومانویت ، منطقیت اور جذباتیت کے اتنے رنگ ہیں کہ اُن سے اسلوب کی ایسی اکائی نہیں بنتی جس بناء پر ہم اقبال کو '' صاحبِ اسلوب انشاپرداز '' کہہ سکیں -

"مکاتیب اقبال پر ایک تنقیدی نظر" میں انھوں نے خطوط اقبال کے ضمن میں تدوین کاروں کی بعض لغزشوں کا ذکر کیا ہے۔ کچھ خطوط کی غلط تاریخوں کی تصحیح کرتے ہوئے مکاتیب اقبال پر تحقیق مزید کی راہ سُجھائی ہے۔ خطوطِ اقبال پر ان کا دوسرا مضمون تنقیدی نوعیت کا ہے اور اس میں اقبال کی ملی حیثیت اور ان کی شخصیت کے بعض گوشے اجاگر کیے گئے ہیں ان کے خیال میں اقبال کے خطوط اُن کی شخصیت کا "ایک صاف اور شفاف آئینہ" ہیں۔

"حیات اقبال کا ایک فیصلہ کن سال" میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ ۱۹۰۷ء، علامہ اقبال کی زندگی میں ایک ایسے انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے، جب اقبال کا ذہن و فکر تبدیلیوں کے فیصلہ کن مرحلے سے گزرا اور یوں یہ سال اُن کی ذات کے علاوہ ملت کے فروغ و ترقی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا۔ مصنف نے اقبال کی شاعری اور اُن کے خطوں سے استشہاد کرتے ہوئے اپنا موقف بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔

"اقبال کا ذہنی سفر (ہندی قومیت سے مسلم قومیت تک)"۔ اسی طرح! "اقبال اور سید جمال الدین افغانی"، مزید برآں: "اقبال کا ایک معاصر ظفر علی خان" میں ڈاکٹر غلام حسین صاحب کی کاوش و جستجو کے ساتھ، ان کے اپنے ذہنی اور فکری میلانات بھی واضح طور پر نظر آتے ہیں، بلکہ بعض مضامین میں تو ان کی شخصیت کا جلالی پہلو بھی منعکس ہوتا ہے۔ یہ صورت "سوشلزم کے بارے میں اقبال کے خیالات" کی ابتدائی سطور میں اور "اقبال خطوط کے آئینے میں" اور "مکاتیب اقبال پر ایک تنقیدی نظر" کے آخری حصوں میں بھی نمایاں ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے زیرِ نظر مجموعے کی صورت میں اس "نا چیز کوشش و کاوش" کو اپنے "قلب و جگر کی گہرائیوں سے ابھرنے والے خیالات" کا آئینہ قرار دیتے ہوئے اسے اپنی "عاجزانہ تحقیقی جستجو کا حاصل" بتایا ہے۔ بلاشبہ کسی بھی علمی مطالعہ کو کامل و اکمل نہیں کہا جا سکتا۔ خصوصاً اقبال کی حیات و شخصیت اور فکر و فن کا مکمل احاطہ تو بہت مشکل ہے۔

یہ اس ہمہ زیرِ نظر مجموعہ ، اقبالیات کا ایک ایسا علمی مطالعہ ہے جو نہ صرف لائق اعتنا ہے اور بعض پہلوؤں سے تحقیق و تنقید اقبالیات میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اقبال کے بارے میں منتخب کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہے ۔

(ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

ضروری اعلان

جولائی ۱۹۹۰ء کا شمارہ

عبداللہ قریشی

نمبر ہو گا

بزمِ اقبال ۔ کلب روڈ ۔ لاہور

تعارف کتب بزم اقبال

(۱)

محمد عبداللہ قریشی ان ماہرینِ اقبالیات میں سے ہیں ، جنھوں نے گذشتہ نصف صدی اقبالیات کی تحقیق و جستجو میں صرف کی ہے ۔ اور انھوں نے پرانی باتوں کو دھرانے کے بجائے اپنے ہر مقابلے اور کتاب میں اقبالیات کے نئے گوشے دریافت کیے ہیں اقبالیات پر ان کا پہلا مقابلہ " معرکۂ اسرار خودی " ہی بے حد مقبول ہوا ۔ اس مقالہ کے بعد انھوں نے اقبال کے مکاتیب ، اور اقبال کے معاصرین سے تعلقات کی کھوج میں ایک عمر صرف کی ہے ۔ گذشتہ تین سالوں[1] میں انھوں نے اقبالیات کے سرمائے میں اپنی تین کتابوں کے ذریعے بیش بہا اضافہ کیا ہے ۔

۱۹۸۶ء میں انھوں نے " اقبال بنام شاد " لکھی ۔ اس کتاب میں انھوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد اور علامہ اقبال کے مراسلات کو مرتب کیا ہے ، ان دونوں شخصیتوں کی خط و کتابت ان کی نجی دلچسپیوں اور حالات کے علاوہ علم و ادب اور فن شاعری سے ان کی وابستگی کے کئی انجانے پہلوؤں سے بھی آشنا کرتی ہے ۔ علامہ اقبال نے اپنی معاشی مجبوریوں کے باوجود اپنی خود داری اور انا کو کیسے بحال رکھا ، اس امر کا پتہ کئی خطوط سے ملتا ہے ، مہاراجہ کشن پرشاد نے انھیں فکر معاش سے بے نیاز کرنے کی خاطر بیش قرار وظیفے کی پیشکش کی ، مگر یہ شاہین زیرِ دام نہ آیا ، اقبال کی خود داری کے علاوہ کئی خطوط سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ تنگ دستی کے باوجود انھوں اپنے نے اعزا کی کفالت کا پورا پورا خیال رکھا ، بالخصوص اپنے

---

۱ - ۱۹۸۶ء ، ۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء -

بڑے بھائی کی اولاد کی نگہداشت کو انھوں نے بے حد عزیز رکھا ، احسان شناسی کا یہ جو ہر علامہ اقبال کی شخصیت کا بڑا نمایاں وصف ہے ، اپنے احباب کے دکھ درد میں شریک ہونے اور ان کے دکھ درد کو بانٹنے کا جذبہ بھی ان میں بدرجہ اتم موجود تھا ، مہاراجہ کشن پرشاد کے بیٹے عثمان کی وفات پر ان کا خط اس حقیقت کا اہم ثبوت ہے ، کشن پرشاد سے خط و کتابت جس دور میں شروع ہوئی ، اس دور میں علامہ اقبال مثنوی اسرار خودی لکھنے میں منہمک تھے ۔ اس مجموعہ کلام کے بارے میں انھوں نے متعدد خطوط میں ، جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے ''مثنوی اسرار خودی'' کے علاوہ ان کے ''فلسفہ خودی'' کی تفہیم میں بھی مدد ملتی ہے ، علامہ اقبال نے ان خطوط میں فلسفیانہ نکات بیان کرنے کے علاوہ بڑے دلنشین انداز میں کئی ایسے اشارے کیے ہیں ، جن سے ان کی شخصیت کے وہ پہلو بھی بے نقاب ہوئے ہیں جن کی طرف ہم نے کم توجہ دی ہے ، نسائی حسن سے ان کا تعلق اور فریفتگی ایک ایسا پہلو ہے جس پر چند ناقدین کے علاوہ اکثر ماہرین اقبالیات نے کم توجہ دی ہے لیکن ان خطوط میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو ان کے اپنے الفاظ میں کھل کر جب سامنے آتا ہے تو سوچنا پڑتا ہے کہ ہم نے اقبال کے فلسفہ کے علاوہ اس کے نازک محسوسات و احساسات کو جنھوں نے اسے بلند پایہ شاعر بنایا ، نظر انداز کر کے ایک بڑی کوتاہی سے کام لیا ہے ، اور ہم اقبال کی شاعری کے کئی سوتوں کی دریافت میں اس کوتاہی کی وجہ سے کامیاب نہیں رہے ، ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

> ''لندن میں ایک انگریز نے مجھ سے پوچھا ''تم مسلمان ہو'' میں نے کہا ہاں لیسرا حصہ مسلمان ہوں'' میں وہ حیران ہو کر بولے ''کس طرح'' میں نے عرض کیا کہ رسول اکرمؐ فرماتے ہیں ''مجھے تمہاری دنیا سے تین چیزیں پسند ، نماز ، خوشبو اور عورت'' مجھے ان تینوں میں سے صرف ایک پسند ہے ، مگر اس تخیل کی داد دینی چاہیے کے نبی کریمؐ نے عورت کا ذکر دو لطیف ترین چیزوں کے ساتھ کیا ہے ، حقیقت یہ ہے کہ عورت نظام عالم کی خوشبو ہے اور قلب کی نماز ۔''

اقبال کے نازک محسوسات کے علاوہ یہ خطوط ہمیں ان کی علمی اور ادبی دلچسپیوں کی وسعت سے آگاہ کرتے ہیں ، اکبر الہ آبادی کی شاعری پر

رائے اور ان سے قلبی تعلق کا اظہار بار بار کیا گیا ہے ، اکبر الہ آبادی کے علاوہ بیدل سے وابستگی کی وجہ سے انھوں نے مہاراجہ پرشاد کو مرزا بیدل کا دیوان ایڈٹ کرنے کو لکھا ، دوسری رائے یہ دی کہ وہ ولی سے چلے کے دکنی شعرا کا کلام شائع کریں ، مثلاً سلطان قطب شاہ کا کلام ، اقبال کی علم دوستی اور علم پروری کا اندازہ بھی ان خطوط سے کیا جا سکتا ہے ، مولانا عبداللہ العمادی کو تصنیف و تالیف کے شعبہ میں شریک کرنے کے لیے جو الفاظ انھوں نے لکھے ہیں ، ان کو پڑھ کر بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اہلِ علم کے کتنے بڑے قدردان تھے ۔ ایک اور ایرانی عالم علامہ شیخ عبدالعلی طہرانی ایک نامور شیعہ عالم کا تعارف بھی جس انداز میں انھوں نے کروایا ہے وہ ان کی وسیع النظری اور علم پروری کی ایک اعلیٰ مثال ہے ، بعض خطوط سے ان کی عربی زبان و ادب سے گہری دلچسپی کا پتہ بھی ملتا ہے ۔ انھوں نے اس بارے میں لکھا ہے :

"اس کے متعلق یہ امر سرکار کے گوش گذار کرنا ضروری ہے کہ عربی زبان کے امتحانات میں پنجاب میں میں اول رہا ہوں ، الگستان میں مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لیے لندن یونیورسٹی کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا ۔"

فقہ اسلام پر انگریزی زبان میں زیر تصنیف کتاب کے متعلق انھوں نے لکھا :

"فقہ اسلام میں اس وقت ایک کتاب بہ زبان انگریزی زیر تصنیف ہے ، جس کے لیے میں نے مصر و شام و عرب سے مسالہ جمع کیا ہے ، جو انشاء اللہ بہ شرط زندگی شائع ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب ہوگی ، میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو تفصیل مسائل کے اعتبار سے ایسا ہی بناؤں جیسی کہ امام سرخسی کی "مبسوط" ہے ۔ جو ساٹھ جلدوں میں لکھی گئی"۔

اس خط میں غالباً عجلت میں علامہ اقبال نے سرخسی کے بجائے "نفی" کا لفظ لکھا ہے ۔ قریشی صاحب نے اس کتاب اور علامہ سرخسی کے بارے میں تعلیقات میں اظہار خیال نہیں کیا ، اس بارے میں آئندہ ایڈیشن میں تفصیلی نوٹ ضروری ہے تاکہ اس امر کا عام قارئین کو پتہ چل سکے کہ علامہ سرخسی

اور ان کی کتاب ''مبسوط'' فقہ اسلامی میں کتنا امتیازی مقام رکھتی ہے ، بلکہ فقہ و تدوین نو کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات پر مبسوط لوٹ بھی ہونا چاہیے کیونکہ وہ فقہی میدان میں مسلمانوں کے تقلیدی رویے کے زبردست مخالف تھے اور ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ ہم تقلید کی بجائے اجتہاد سے کام لے کر عصری تقاضوں سے فقہ کو ہم آہنگ کریں ۔

عربی ادب اور فقہ اسلامی سے گہری دلچسپی کے علاوہ کئی خطوط اس امر کے بھی مظہر ہیں کہ علامہ اقبال کو سنسکرت ادب سے بھی لگاؤ تھا ۔ وہ رامائن کو اردو قالب میں ڈھالنے کے آرزو مند تھے ۔ رامائن کے علاوہ گیتا کا اردو میں ترجمہ کرنے کا بھی وہ ارادہ رکھتے تھے ۔ ''گائیتری'' کا انھوں نے ''آفتاب'' کے زیر عنوان ترجمہ ''بانگ درا'' میں شائع کیا ، گائیتری رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہے ، گائیتری پر ۱۹۰۲ء میں ''مخزن'' میں جو تمہیدی شذرہ لکھا ، اسے تعلیقات میں شامل کرکے قریشی صاحب نے سنسکرت سے اقبال کی والہانہ شیفتگی کا ثبوت فراہم کر دیا ہے ۔ اکثر خطوط کے ساتھ شامل تعلیقات بڑی معلومات افزا ہیں ، جنھوں نے اس کتاب کی تحقیقی ، علمی اور ادبی افادیت میں اضافہ کیا ہے ۔ علامہ اقبال میوزیم میں موجود سر اکبر حیدری اور مولوی عبدالرزاق کے انگریزی خطوط کا ترجمہ بھی تعلیقات کا حصہ ہے ۔ یہ اہم دستاویزات علامہ اقبال کے اس مجموعہ کلام کے متعلق ہیں جسے علامہ اقبال کی اجازت کے بغیر مولوی عبدالرزاق نے علامہ عبداللہ العماری کی تقریظ کے ساتھ حیدر آباد سے شائع کیا ، اس وقت تک علامہ اقبال کا پہلا اردو مجموعۂ کلام منظر عام پر نہیں آیا تھا ، آفتاب اقبال کے بارے میں تعلیقات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں ، علامہ اقبال کے بڑے فرزند کے بارے میں اتنی جامع معلومات دیگر کتب میں دستیاب نہیں ، علامہ شیخ عبدالعلی طہرانی ، سید علی بلگرامی اور علامہ عبداللہ العمادی ، نواب سر ذوالفقار علی خان پر تعلیقات بھی ان شخصیات کے علمی کمالات سے متارف کرانے کی اہم کوشش ہیں مقدمہ میں مہاراجہ کشن پرشاد کے سوانح حیات اور علامہ اقبال سے ان کے تعلقات پر جو سیر حاصل بحث کی گئی ہے وہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے ۔ ان خطوط کی تلاش اور کشن پرشاد کے احوال کی جستجو کے لیے محمد عبداللہ قریشی صاحب نے جس تحقیقی لگن کا مظاہرہ کیا ، وہ قابل داد ہے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے ۱۹۴۲ء میں ''شاد اقبال'' کے نام

سے جو خطوط مرتب کیے اس مجموعے میں علامہ ۹۴ اور مہاراجہ کے ۵۲ خطوط ہیں ۔ علامہ اقبال کے پچاس نئے خطوط کی دریافت کا سہرا قریشی صاحب کے سر ہے ، اس نئے مجموعے میں علامہ اقبال کے ۹۹ اور مہاراجہ کے ۵۲ خطوط ہیں ۔ روز مرحوم کو قریشی صاحب سے زیادہ سہولتیں حاصل تھیں ، ان کی براہِ راست حیدر آباد کے کتب خانوں تک رسائی تھی لاہور میں رہ کر ہندوستان اور حیدر آباد کے ادیبوں اور شاعروں سے پچاس نئے خطوط کا سراغ لگانا یقیناً ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے ۔

۱۹۸۵ء میں محمد عبداللہ قریشی صاحب نے ''حیات جاوداں'' کے نام سے ان تمام تاریخوں اور نوحوں کو مرتب کیا ہے جو علامہ اقبال نے اپنے عزیزوں ، بزرگوں یا اہم مقامات و عمارات کے بارے میں لکھیں ، کئی سالوں پر محیط اس سرمائے کو یکجا کرنے کے لیے اڑی تگ ودو کی ضرورت تھی ، اس ذخیرے کو فراہم کرنے کے لیے انھوں نے مختلف مقامات اور کتب کو دیکھنے کے علاوہ لدھیانے ، سیالکوٹ اور لاہور کے قبرستانوں کی خاک بھی چھانی ہے ، ان تمام مقامات کا سراغ لگانے کے علاوہ انھوں نے ان تمام تاریخوں کو وسیع علمی اور تاریخی تناظر میں پیش کیا ہے ، ان تاریخوں کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال مختلف عزیزوں اور دوستوں سے کتنا گہرا قلبی ربط رکھتے تھے اور ان کی جدائی پر کس قدر متاثر ہوئے ، قلبی واردات نے ان تاریخوں کو محض ایک فنی شعبدہ گری کی سطح سے بلند کر کے ایک تخلیقی مقام بخشا ہے ، کتب اور تاریخی عمارات سے متعلق اظہار میں یہ تخلیقی عنصر نمایاں نظر آتا ہے ، لیکن علامہ اقبال نے ان تاریخوں کو باقاعدہ اپنے مجموعوں میں جگہ نہ دی ، اس لیے ان کی فراہمی بڑا مشکل کام تھا ، لیکن قریشی صاحب نے اس ذخیرے کو یکجا کرنے کے لیے اڑی تگ ودو کی ہے کلام کی دریافت کے علاوہ انھوں نے کوشش کی ہے ،کہ جس شخصیت کے بارے میں تاریخ کہی گئی ہے ، اس شخصیت کے ضروری کوائف اور علمی و ادبی کارموناں سے بھی روشناس کرایا جائے جو تاریخ کسی تصنیف سے متعلق ہے اس تصنیف کا بھی پورا تعارف کروایا گیا ہے ، اگر کسی تاریخی عمارت کا ذکر ہے تو اس عمارت کی نشاندہی کے علاوہ تعمیر کرنے والے کے حالات سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی ہے ، ان اہم نکات کا خیال رکھنے کی وجہ سے یہ کتاب ہمیں کئی باکمال شخصیات سے متعارف کرواتی ہے جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا ۔ اقبال کے عہد کے نامور معاصرین سے

آگہی کے لیے یہ کتاب بڑا اہم تحقیقی مواد فراہم کرتی ہے ، اقبال اور ان کے عہد کے علمی اور ادبی تناظر کو ایک مختصر کتاب میں یک جا کر دینا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے جو غیر معمولی لگن اور والہانہ تحقیقی شیفتگی کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا ، اقبال کی فکر اور فن سے برسوں کی شیفتگی نے انھیں یہ کارنامہ سر انجام دینے میں مدد دی ہے ۔

قریشی صاحب کی تیسری کتاب ''تذکار اقبال'' ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آئی ہے اس کتاب میں انھوں نے محمد الدین فوق مرحوم کی ان تمام تحریروں کو یکجا کیا ہے جو مختلف کتابوں اور رسائل میں بکھری پڑی تھیں ، یہ کتاب دو باکمال شخصیات کی ہم سفری ، ہم قدمی اور ہم سخنی کی اہم یادگار ہے ۔ محمد الدین فوق مرحوم کے ساتھ علامہ اقبال کے فکری اور عملی رفاقت کا سلسلہ تقریباً چار دہائیوں پر محیط ہے ، ۱۸۹۷ء سے علامہ اقبال کے ساتھ انھوں نے مشاعروں میں شرکت کا آغاز کیا ، اور شعر و سخن کی محفلوں کے علاوہ انھوں نے کشمیری مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی سال تک انجمن کشمیری مسلمانان میں شانہ بشانہ کام کیا ، دونوں کی مساعی سے پنجاب میں آنے والے کشمیریوں کو پہلی دفعہ زرعی اراضی حاصل کرنے کا حق حاصل ہوا ، اور فوج میں بھرتی ہو کر اپنے عسکری جوہر دکھانے کا موقع ملا ، فوق صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ اقبال نے انھیں مجدد کشمیر کہا ، علامہ اقبال کے مختصر حالات ان کی چند غزلوں کے ساتھ ''بہار گلشن'' کے نام سے سب سے پہلے فوق ہی نے چھاپے ، ۱۹۳۲ء میں مشاہیر کشمیر کے دوسرے ایڈیشن میں اقبال کے حالات کو انھوں نے اور زیادہ تفصیل سے پیش کیا ۔ علامہ اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے والد محترم کی سوانح لکھتے ہوئے ''زندہ رود'' میں تسلیم کیا ہے کہ اقبال کے اپنے احباب میں سب سے پہلے ان کے حالات زندگی پر مضمون فوق نے تحریر کیا ، کئی برسوں کی اس رفاقت کی علمی یادگاروں کو یکجا کرنے کے لیے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی ، جسے ان دونوں شخصیات سے گہری دلچسپی ہو ، اس کام کے لیے محمد عبداللہ قریشی سے بڑھ کر کوئی اور شخصیت موزوں نہیں تھی ، فوق مرحوم سے ان کی دوستی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ، برسوں تک فوق صاحب اور وہ یک جان دو قالب رہے ، فوق مرحوم کی معیت میں انھوں نے کشمیر کے کئی سفر کیے اہل کشمیر میں آزادی کی روح پھونکی ، فوق صاحب کی کئی کتب

کو محفوظ رکھنے اور انھیں منظر عام پر لانے کا فخر بھی قریشی صاحب کو حاصل ہے ، تاریخ اقوام کشمیر کی تیسری جلد الٰہی کی بدولت چھپی اور ان کی سوانح کے علاوہ ان کے دیگر قیمتی علمی اور ادبی سرمائے کو وہ حرز جان بتائے ہوئے ہیں ۔ علامہ اقبال سے متعلق فوق مرحوم کی تمام تحریروں کو انھوں نے ''تذکار اقبال'' میں بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے ، مقدمہ میں انھوں نے منشی محمد الدین فوق کی شخصیت اور کردار پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے فوق کی شخصیت اور علمی کارناموں کو جاننے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے ، یوسف ٹینگ کا مقالہ ''دیوان عشق'' اقبال اور فوق کے کشمیر سے گہرے ربط کو واضح کرتا ہے ، ان دونوں فرزندانِ کشمیر نے اہل کشمیر میں بیداری پیدا کرنے اور ان کو غصب شدہ حقوق دلانے کے لیے جو جہد کی ، اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ، یہ مقالہ اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ اہل کشمیر اب تک علامہ اقبال اور فوق مرحوم کے ممنون احسان ہیں کہ ان دونوں نے سب سے پہلے ان کے حقوق کی ترجمانی کی اور ان کی رہنمائی میں تحریک آزادیٔ کشمیر کا آغاز ہوا ، ''مشاہیر کشمیر'' اور ''نیرنگ خیال'' کے اقبال نمبر میں فوق نے علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی اس کتاب میں شامل ہیں ۔ تاریخ اقوام کشمیر جلد اول اور دوم میں مسلمان خاندان کے جائزے میں فوق نے علامہ اقبال کے نسبی حالات و کوائف کے بارے میں جو کچھ لکھا ، اس سے علامہ اقبال کے آباؤ اجداد کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں ، وہ اب تک اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہیں ، انہی معلومات سے علامہ اقبال کے سبھی سوانح نگاروں حتیٰ کہ جاوید اقبال نے بھی استفادہ کیا ہے ، ''تذکار اقبال'' کا اہم ترین حصہ فوق مرحوم کی غیر مطبوعہ سوانح ''سرگذشت فوق'' سے ماخوذ ہے ، اپنی سوانح میں فوق نے علامہ اقبال کے متعلق جن تاثرات و مشاہدات کو بیان کیا ہے ، ان سے پہلی بار متعارف کروایا گیا ہے ۔ ۱۹۴۱ء میں ''استادوں اور شاگردوں کے لطیفے'' کے نام سے جو کتاب مرتب ہوئی اس میں بھی فوق نے اقبال کو شامل کیا ہے ، اقبال کو ایک استاد اور ایک بذلہ سنج کی حیثیت سے جاننے کے لیے یہ لطائف بڑی اہمیت رکھتے ہیں کتاب کے آخر میں فوق کے نام تمام خطوط اقبال کو یکجا کیا گیا ہے ، یہ خطوط فوق اور اقبال کے روابط کے علاوہ کئی مسائل میں ان کی ہم فکری کے آئینہ دار ہیں ، فوق کے اخبار کشمیری میں علامہ اقبال کے متعلق چھپنے والے مضامین اور خبروں کو بھی اس کتاب میں

جگہ دی گئی ہے ۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب ہمیں فوق اور اقبال دونوں کی عملی اور ادبی خدمات سے آگہی بخشتی ہے ۔ ''حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیوں'' میں قریشی صاحب نے جن حقائق کو یکجا کیا تھا ، ان حقائق کی تکمیل کی ایک کڑی یہ کتاب ہے ، اس کے مطالعہ سے علامہ اقبال کی شخصیت اور فن کے دو پہلوؤں سے بالخصوص آگہی حاصل ہوتی ہے ۔ اقبال کا سلسلۂ نسب اور کشمیر کی تاریخ ، تہذیب اور کشمیریوں کے حقوق سے اقبال کی گہری وابستگی ، ''تذکار اقبال'' میں اقبال کی تعلیمات اور شخصیت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے کافی نایاب مواد جمع ہے ، عبداللہ قریشی نے ان معلومات کے لیے بہت سی ان کتابوں اور رسائل کی ورق گردانی سے بے نیاز کر دیا ہے جن تک رسائی خواص کے لیے بھی مشکل ہے ۔

بحیثیت مجموعی یہ تینوں کتابیں اقبال کی فکر اور فن کے کئی گراں بہا پہلوؤں سے آشنا کرتی ہیں اور اقبالیات میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان تینوں کتابوں کو گذشتہ تین برسوں میں بزم اقبال لاہور نے شائع کیا ہے ۔

ڈاکٹر غلام حسین اظہر

(۲)

منشوراتِ اقبال

مرتبہ : خلیفہ عبدالحکیم

قیمت : ۳۵ روپے

بزم اقبال کلب روڈ ، لاہور

''فکرِ اقبال'' کے مصنف اور ممتاز مفکر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی زندگی میں ایک یہ کام بھی کیا تھا کہ ریڈیو سے اقبال کے بارے میں مختلف اوقات میں جو تقریریں نشر ہوتی رہیں ان کا ایک انتخاب مرتب کر دیا ۔ خلیفہ صاحب کو احساس تھا کہ :

''ریڈیو پر بہت کچھ نشر ہوتا ہے جو کسی تصنیف میں منضبط نہ ہونے کی وجہ سے ہوا میں اڑ جاتا ہے ، یعنی برباد ہو جاتا ہے ۔''

ان مضامین کو منضبط کرنے کا مقصد انھیں بربادی سے بچانا تھا ۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مجموعہ مرتب ہو کر چھپا اور اوجھل رہا اور اب ڈاکٹر وحید قریشی کی مساعی سے دوبارہ شائع ہوا ہے ۔

اس کتاب کے مقالہ نگاروں میں ایسے اصحابِ فکر شامل ہیں جنھیں ماہر اقبالیات تسلیم کیا جا چکا ہے اور جو اقبال کو ہمیشہ نئے زاویوں سے تلاش کرتے ہیں ، مثال کے طور پر تصوراتِ اقبال کی ذیل میں فلسفۂ خیر و شر پر خلیفہ عبدالحکیم کے اپنے ارشادات درج ہیں ۔

خودی کے مسئلہ پر نذیر نیازی ، تصورِ وطن پر مولانا اصلاح الدین احمد، تصوف کے موضوع پر صوفی تبسم کی تقریر پیش کی گئی ہے ، تلمیحات میں سے ڈاکٹر عاشق بٹالوی نے ''خلیل اور کلیم'' کی تلمیحات پر روشنی ڈالی ہے ۔ اقبال کی تفہیم کے لیے ان کا موازنہ سنائی ، عطار ، مجدد الف ثانی اور برگساں کے تصورات سے بھی کیا گیا ہے اور ان سے اقبال کے استفادہ کی جہات بھی تلاش کی گئی ہیں ، اس حصے کے مقررین میں ڈاکٹر محمد باقر ، سید عابد علی عابد ، برہان احمد فاروقی ، اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان شامل ہیں ۔ اس کتاب میں ایسے نوادر جمع ہو گئے ہیں جن میں اختصار اور جامعیت روحِ حکمت ہے ۔ موضوع وسیع ہے لیکن اس کا احاطہ معین وقت میں کرنے کے لیے کفایت لفظی سے زیادہ کام لیا گیا ۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس سے پڑھنے والے کی سوچ کی لہر موجزن ہو جاتی ہے ۔ خلیفہ صاحب نے ان بکھرے ہوئے موتیوں پر خود اپنے قلم سے مقدمہ لکھا ہے جو اجمال کی مثال ہے ۔ بزمِ اقبال نے اسے خوبصورت انداز میں پیش کیا اور ایک کم شدہ تالیف کو منظرِ عام پر آنے کا موقعہ دیا ۔ اس کے لیے بزمِ اقبال کے معتمد اعزازی ڈاکٹر وحید قریشی مبارکباد کے مستحق ہیں ۔

(ڈاکٹر انور سدید)

۱ ۔ ''اقبال شناسی اور محور''
صفحات : ۲۰۳
قیمت : ۲۵ روپے

۲ ۔ ''اقبال شناسی اور جرنل ریسرچ''
صفحات : ۲۷۶
قیمت : ۹۰ روپے

ناشر بزمِ اقبال لاہور، مرتب: پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ۔

اقبال جتنی عظیم شخصیت اور اقبالیات جیسا اچھوتا موضوع دنیا کی کسی بھی زبان و ادب کے لیے باعثِ فخر و افتخار ہو سکتا ہے۔ غالب کو اپنی عظمت کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنے اشعار کو ''نوائے سروش'' سے تعبیر کیا تھا لیکن مولانا حالی کو فرشتوں کی یہ برتری مناسب نہ لگی چنانچہ انھوں نے فرمایا :

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اور اگر ہم کلامِ اقبال کی نیرنگیاں ، فکر کی وسعتیں ، فن کی بلندیاں ، اور مقاصد کی عظمتیں ملاحظہ کریں تو انسانیت ہی معیار ہمیں اپنی واضح شکل میں نظر آتا ہے۔ اقبال ایک شخص کا نہیں ، ایک تہذیب ، ایک اجتماعی جذبے ایک قومی علامت اور زبردست ملی شعور کا نام ہے۔

علامہ کی اپنی تصانیف و تخلیقات اگرچہ چند مجموعوں تک محدود رہیں لیکن اقبالیات پر اب تک جتنی کتب تصنیف ہو چکی ہیں بلاشبہ ان سے ایک وسیع لائبریری بن سکتی ہے۔ ہزاروں کتابوں کے علاوہ ایک گراں بہا ذخیرہ ان مقالات و مضامین پر مشتمل ہے ، جو اردو کے متعدد رسائل و جرائد میں بکھرا پڑا ہے۔ اور آج اقبالیات کے ضمن میں ''کارِ لائق انجام'' دینے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان منتشر جواہر پاروں کی شیرازہ بندی کی جائے۔

اس سلسلے میں ''بزمِ اقبال لاہور'' نے ایک مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنی خصوصی دلچسپی اور لگن کے ساتھ اس کام کا آغاز کیا ہے اور اردو کے مختلف رسائل و جرائد میں اقبالیات سے متعلقہ مواد کو یکجا کرکے ان کا انتخاب ، کتابی صورت میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے میں منظرِ عام پر آنے والی کتب میں معروف ادبی مجلوں ، ''فنون'' ''سیارہ'' ، ''ادبی دنیا'' ، بہاولپور سے شائع ہونے والے ''نخلستان'' ، اسلامیہ کالج سول لائنز کے ''فاران'' اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے ''کریسنٹ'' ، اسلامیہ کالج کوپر روڈ کے ''عمل'' ایف۔ سی کالج کے ''فولیو'' انجینئرنگ یونیورسٹی کے ''ایکو'' ، دیال سنگھ کالج کے ''افشاں'' اور پنجاب یونیورسٹی کے ''محور'' اور ''جنرنل ریسرچ'' میں موجود اقبالیات کے پریشاں جواہر کو کتابی لڑیوں میں پرو دیا گیا ہے۔

ہمارے زیر مطالعہ مؤخرالذکر دونوں رسائل کے مجموعہ ہائے انتخاب ہیں ۔ ان دونوں کتابوں کو معروف محقق اور اقبال شناس ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے مرتب کیا ہے ۔ دونوں کتابوں میں کل پچیس مضامین ہیں جن میں تئیس اردو اور دو انگریزی مضامین ہیں ۔ ڈاکٹر ہاشمی صاحب کا انتخاب قابل داد ہے اور منتخب شدہ تمام مضامین و مقالات اقبالیات کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل تحریریں ہیں ۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ، ڈاکٹر وحید قریشی ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر ، پروفیسر محمد منور ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور فتح محمد ملک کی تحریر اقبالیات کے ضمن میں اڑے وقیع نثر پارے ہیں ، دونوں کتابوں کے آخر میں مذکورہ رسائل میں موجود اقبالیات سے متعلق دیگر مضامین کی فہرست بھی دے دی گئی ہے ۔

اقبالیات کے ذیل میں تحقیق و تدوین کا یہ سلسلہ اسی خلوص اور لگن کے ساتھ جاری رہنا چاہیے اور عوام و خواص کو اقبال سے آگاہ کرنے کی ہر ممکن کوششیں جاری رہنا چاہئیں کیونکہ ایسی شخصیات روز روز پیدا نہیں ہوا کرتیں ۔

مختلف ادوار میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں یکے بعد دیگرے غالب سرسید ، حالی، شبلی، قائداعظم ، ظفر علی خان اور مولانا مودودی جیسی نابغہ روزگار شخصیات جنم لیتی رہی ہیں اور تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہی ہے ۔ میرا سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال نے حب الوطنی ، اسلامی فکر اور اردو شاعری کو جتنے عروج اور جس معیار تک پہنچا دیا ہے ، جس آل راؤنڈ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے ، جس ہمہ جہتی ، ہمہ رنگی اور ہماہمی کا ثبوت دیا ہے کیا اب کے تاریخ کے لیے ایسا کرنا ممکن ہو سکے گا ؟

(اشفاق احمد ورک)

مجلسِ ترقیِ ادب لاہور کی چند اہم مطبوعات

۱ - تاریخ ادب اردو : جلداول ، از ڈاکٹر جمیل جالبی ...	100/-
۲ - تاریخ ادب اردو : جلد دوم ، از ڈاکٹر جمیل جالبی ...	180/-
۳ - تعلیقات خطبات گارسیں دتاسی : از ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین ...	70/-
۴ - سندھ میں اردو شاعری : از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ...	30/-
۵ - زبان اور شاعری : از محمد ہادی حسین ...	15/-
۶ - البدیع : از سید عابد علی عابد ...	30/-
۷ - مقالات تاثیر : مرتبہ ممتاز اختر مرزا ...	60/-
۸ - مولانا ظفر علی خان — احوال و آثار : از ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی ...	50/-
۹ - تاریخ لاہور : از کنہیا لال ...	70/-
۱۰ - حلقۂ ارباب ذوق : از یونس جاوید ...	45/-
۱۱ - دیوان غالب — منظوم پنجابی ترجمہ : از اسیر عابد ...	90/-
۱۲ - کلیات ناسخ : جلد اول ، مرتبہ یونس جاوید ...	93/-
۱۳ - نفسیاتی تنقید : از ڈاکٹر سلیم اختر ...	60/-
۱۴ - آغا حشر کے ڈرامے : جلد اول ، مرتبہ عشرت رحمانی ...	70/-
۱۵ - جدید فارسی شاعری : ترجمہ از ن - م - راشد ...	50/-
۱۶ - شذرات فکر اقبال : طبع دوم ترجمہ از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ...	18/-
۱۷ - خطبات اقبال : (پنجابی ترجمہ) از پروفیسر شریف کنجاہی ...	30/-
۱۸ - جاوید نامہ : (منظوم پنجابی ترجمہ) از پروفیسر شریف کنجاہی ...	19/-
۱۹ - ذکر رسول ؐ — مثنوی رومی میں : از ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی ...	25/-

ان کے علاوہ کلیات میر ، کلیات مصحفی ، کلیات غالب فارسی، تذکرے ، داستانیں اور تنقید و تحقیق کی اہم کتابیں دستیاب ہیں ۔

مجلس ترقیِ ادب - کلب روڈ - لاہور

فون : 64262

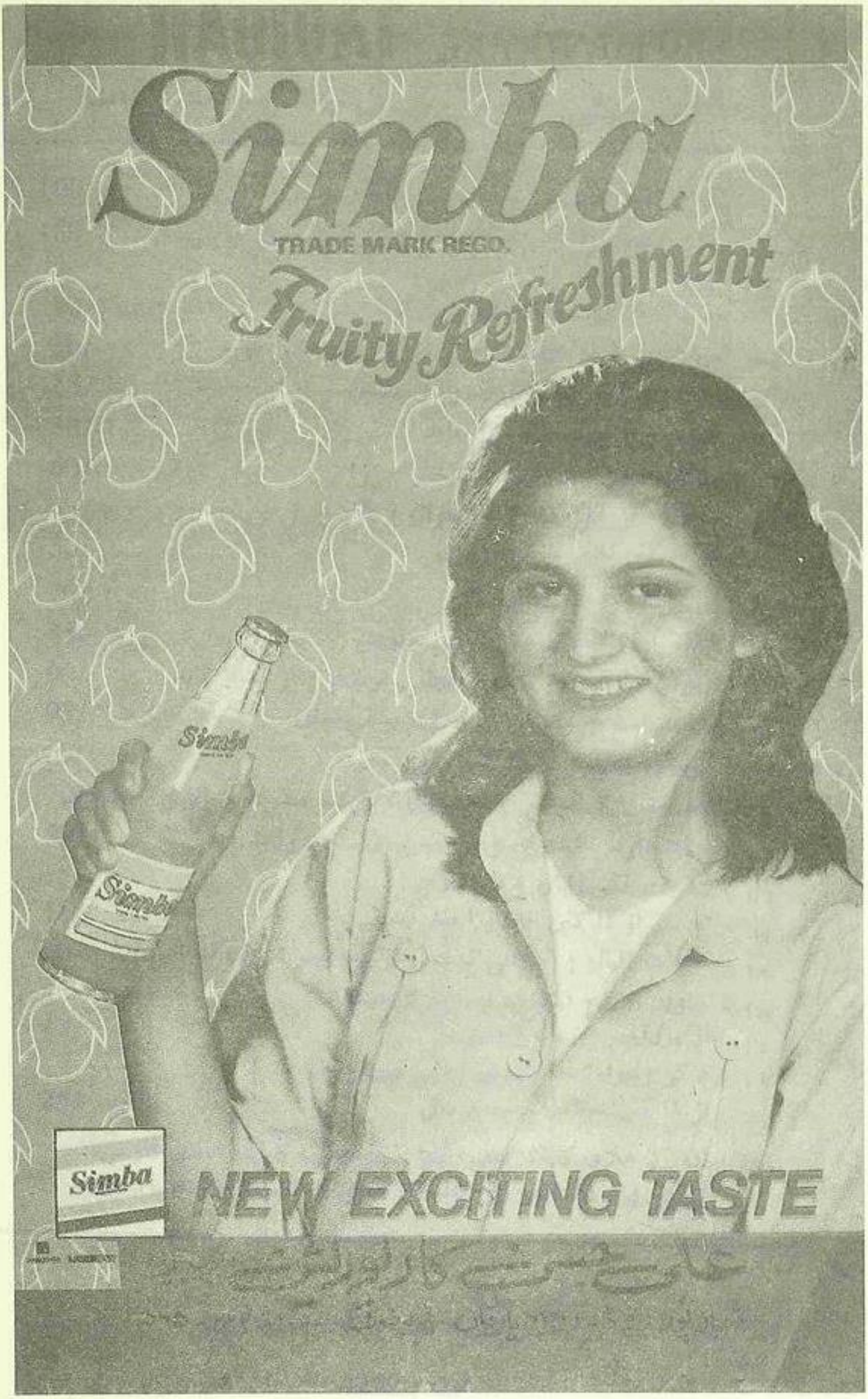
Simba
TRADE MARK REGD.
Fruity Refreshment
Simba
Simba
NEW EXCITING TASTE

گفت یزداں کہ چنین است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنین است و چناں می بایست

All these ideas and attitudes of Iqbal towards God, Nature and Man are based on the tragic realities of life. But these ideas and attitudes are traditionally treated as negative out look on life. Iqbal was capable of being a superb exponent of negative out look on life. Had he fully exploited this capacity, he might have been on of the greatest writers of tragedy. But he was destined to be otherwise. One can not be sure at what point of his life he, abandoned thinking negatively about life, or since when he started to be reconciled to life. However, one fact is quite obvious. Before he became a life affirming poet of world stature, he travelled a long way from negation to affirmation. Perhaps he completed this journey by the time he formulated his philosoply of "self" (*Asrar-e-Khud*). He got reconciled to life and began to look at life in an affirmative manner. He did not deny the defects and imperfections of the world we live in. Nevertheless, his advice to man is this :

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

(Though Nature does not lack in good taste, get accomplish ye what has been left unaccomplished by her).

Iqbal was destined to be a poet of human potentialities and possibilities, not of human limitations and miseries. In his subsequent poetry and in the larger portion of his poetry he insisted upon the fact that Man is capable of enlarging the area of his freedom and narrowing his limitations. Through ceaseless efforts and creative actions, he can transform his powerlessness into powerfulness, dependence into independence and pre-determinism into freedom. He can attain mastery over himsalf as well as the world arround him.

Such lines or verses are not in abundance in Iqbal's poetry but they speak volumes about his complaints againt, Nature or God. In his mature and exqisite Persian poetry of *Payam-e-Mashriq* or *Zaboor-e-Ajam* we find such verses here and there :

این کوہ و صحرا ، این دشت و دریا
نے راز داراں نے غم گساراں

These mountains and forests
These deserts and rivers
They are niether confidants of human beings
Nor Sharers of human sorrows.

There were moments when Iqbal felt man to be an insignificant and helpless creature and yet held accountable for whatever he does in this world :

گناہ ما چہ نویسند کاتبان عمل
نصیب ما ز جہانِ تو جز نگاہے نیست

(Why do the angels record my sins ? My share is this world, O God ! is nothig more tham observing what is happening in the world).

All these modes of feeling led Iqbal to formulate an extremely bitter view of the world which is best expressed perhaps in this verse :

تماشا گاہ مرگ ناگہان را
جہان ماہ و انجم نام کردند

(This world which is a sad spectacle of sudden death has been named a world of stars and Moon)

This verse shows how much Iqbal distrusted the beauty of the world and how penetrating were his eyes in seeing the hidden tragic aspects of it. He did not accept the world as God wants Man to do. He suggests that the world should have been carved in quite a different fashion so that it might have suited mankind.

کوئی نہیں غم گسار انساں
کیا تلخ ہے روزگار انساں

In this poem Iqbal complains that Nature has been peculiarly trynnical to Man (Human being). She has made him curious about secrcts (of life or universe) but at the same time has taken special care to conceal the secrets from him. This world is just a house of glass which gives only a sense of wonder, not only in the beginning but also at the end. When we look at the objccts of Nature, we find that though they are determined in their movement, yet they are busy about deriving pleasure from their existence. But there is nothing in the universe which may be called sharer of human sorrows. How bitter is the life of human beings !

Iqbal's feeling that Nature is a great tyrant and sadist has found superb expression in one of the verses of a *Ghazal* (the most popular form of urdu poetry) included in his book *Bal-e-Gibreel* which is one of his masterpieces in urdu poetry. Since urdu poets are not used to give the dates of composition of their poems it is not possible to say or surmise as to when that verse was composed by Iqbal. However the one verse is more eloquent than many poems composed on the theme in question. The verse is :

یہ مشت خاک ، یہ صرصر ، یہ وسعت افلاک
کرم ہے یا کہ ستم ، تیری لذتِ ایجاد

In this verse niether the word 'Nature' has been used nor the word 'God' has been employed. But as every student of literature knows, Nature and God are interchangeable in poetry. In the verse quated, Iqbal addresses himself directly to God and says : This handful of dust (Man) has been left in an infinitely vast world where he is faced with violent wind. One wonders if Thy pleasure of invention should be taken as Thy benevolence or oppression. Human predicament in the universe can not be given a more beautiful expression and the complaint to God can ever be expressed in a more beautiful style.

anxieties. Among such poems I would particularly refer to "*Insan*" (Man) which is certainly not a great or major poem but which is a philosophical indictment of the callous joke which Nature has cracked with mankind. It will not be out of place to quote this short poem here :

انسان

قدرت کا عجب یہ ستم ہے !
انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

ہے گرم خرام موج دریا
دریا سوئے بحر جادہ پیما
بادل کو ہوا اڑا رہی ہے
شالوں یہ اٹھائے لا رہی ہے
تارے مست شراب تقدیر
زندان فلک میں ہا یہ زنجیر
خورشید وہ عابد سحر خیز
لانے والا پیام 'برخیز'
مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر
پیتا ہے مے شفق کا ساغر
لذت گیر وجود ہر شے
سرمست مے نمود ہر شے

terms of its Islamic definition by abandoning the western concept of nationalism. Here I do not propose to enter into further details or implications of this change.

As a matter of fact my main topic is the change in his poetry of nature. Though a romantic, he was unlike all the romantic poets of the nineteenth century who rhymed in the English Language. A great lover of beauty as he was, he did not find what may be called the solace of soul in natural as well as human beauties. What perturbed him most was the transience of natural beauties and the brevity of the relationship between the lovers. There is a peculiar strain of restlessness almost in all the poems he has written about the beautiful objects of nature. In his 'Stray Thoughts' he has confessed that his study of Wordsworth saved him from being an atheist. But his romantic poetry does not reflect the type of spirituality one finds in Wordsworth. However, if Iqbal did not perceive any spirituality in Nature, he did not direct his observation towards the '*Red Claws*' of Nature either. His problems were different from the English romantic poets. In the romantic phase of his poetry he appears to be burning with some inner anguish. This anguish can be traced or related to the dissatisfaction which the failure of his first marriage had brought to him on the one hand and the attraction he was experiencing in Atia Begam Faizi and one of his German tutors Emma Weganast during his stay in Germany on the other hand. This is the obligation of his biographer to relate all the relevant factors of Iqbal's life and see how all the factors influenced his romantic poetry. His philosophical bent of mind also played a significant role in the shaping of his romantic poetry. The anguish and loneliness he was suffering from as a result of his unhappy youth began to find expression as a cosmic factor in human life at large. Iqbal's Letters to Atia Begam Faizi reveal that he was extremely disgusted with his life and some of his early poems indicate his painful feeling that man has been thrown by Nature into a very unsympathetic world with no one to share his sorrows and

national representation of life in poetry but also on the depiction of the beautiful aspects of Nature. This was probably an indirect impact of the English romantic poets of the ninteenth contury on Urdu poetry. Because of his direct acquaintance with the romantic poetry, Iqbal too was deeply interested in composing poems on different manifestations of Nature, such as the grandeur of mountains, the beauty of the Moon, the fragrance of the roses, the relation between the nightingale and the rose, the serne music of the rivers, etc.

The trends which Iqbal inherited from his immediate, rather contemporary predecessors, were related mainly with two themes of poetry——(1) poetry concerning objects of nature and (2) poetry concerning national problems. As far as the second theme is concerned, Iqbal started as a nationalist poet in terms of the western concept of nationalism which was adopted by All-India Congress, claiming that all the communities, whatever their religions and cultures, living within the geographical frontiers of India constitute one and only one nation. Within a short time, Iqbal switched over from this concept of nationalism to the Islamic view of nationlism which is based on religious community instead of confined to geographical boundaries. This change-over in Iqbal's outlook culminated ih his famous presidential address of 1930 which he delivered in the annual session of thc All-India Muslim League held at Allahabad. In that historic address he dwelt on the concepts of nationalism at length and tried his best to prove that the Indian Muslims were not a minority but a nation by themselves, judged by any criterion of nationhood. That address became the corner-stone of Pakistan by reinvigorting the demand for the division of India as the most satisfactory solution of the Hindu-Muslim issue.

What I am driving at is the idea that there were two major changes in the early poetry of Iqbal which made him the poet he is popularly known. One of them is that he turned a nationalist in

Nazeer Siddiqi

Iqbal's journey from negation to affirmation

That Iqbal underwent a number of intelleetual and conceptual changes is a fact which cannot be denied. Generally, such changes are treated as evolutionary by the admirers and self-contradictory by the detractors of the poet. However it is not necessary that every change should reflect some sort of evoliution in thought or some decline in the mode of thinking. Man has had to chose between the hard realities of life and the expendient stand in a given situation created by subjective circumstances or objective predicament. This is precisely what Iqbal did in his development as a poet. He started as one kind of poet and ended as a quite different poet. But this is far from saying that in the beginning he was a Romantic poet, interested in the manifestation of Nature, and later on he became a national poet of the Muslim Umma which required him to express himself on all the major issues of the day.

The national concerns are one of the most salient features of Iqbal's poetry. He was intensely concerned with the fate of his nation throughout his life.

Iqbal's poetic life began in the atmosphere which was built up by poets like Mohammad Husain Azad, Altaf Husain Hali, Allama Shibli Nomani and Akbar Allahabadi. All of these poets had very strong national leanings. Azad and Hali, the founders of modern Urdu poetry, had laid stress not only on the moral and

Is a picture-show,
Tale of lengthy night
Of non-existence.
Being product of
Nature's law of change
That alone is cute
Which decays and dies."
Standing near, the moon
Heard the dialogue.
Rumoured on the sky,
Morning star too learnt.
Hearing from the star,
Dawn whispered to dew,
Leak the sky's news.
To earth's confidant.
Message of dewdrop
Flooded flower's eyes.
Tiny heart of the bud
Bled out of distress.
Spring departed from
Flowerbed in tears.
Youth come for a stroll
Left in pensive mood.

———

Breathing in whose clime
Is divine bliss,
That very land is mine,
That very land is mine.

(11) Ouintessense of Beauty : حقیقت حسن

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

کہیں قریب تھا ، یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی ، اخترِ سحر نے سنی

سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو

بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا ، سوگوار گیا

کلیات (اردو) ص ۱۱۲

One day beauty asked
Maker of the world !
"Why didn't you, Lord !
Make me immortal ?"
God answered : "The world

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

کلیات (اردو) ، ص ۸۵

Where Chishti did once
Preach the cult of truth,
Garden where Monk Nanak
Sang songs of oneness,
Which Tartars did
Own as native land,
Which lured Arabs to
Quit their desert homes
That very land is mine,
That very land is mine.

Chunk of earth which had
Wonder-struck the Greeks,
Which gave to the world
Taste of science and arts,
Soil which is blessed
With the Midas touch,
Which had filled with pearls
Coffers of the Turks,
That very land is mine,
That very land is mine.

To the stars fallen
From the persian skies
Which giving new glow
Restored it to hights,
From where heard the world
Strains of unity,
Which sent cool winds to
Prephet of Islam,
That very land is mine,
That very land is mine.

Whose men are Moses
And mountains Sinai,
Where the ship of Noah
Laid its anchor once,
Whose earth's staircase
To the lofty skies,

Co-singers thought my
Songs were gift of spring
They don't know what my
Love song signify.

From my flesh and blood
This world you have made.
What is martyr's prize
But unfading flush ?

Pampered by your graces
My life's passing smooth.
No blaming of friends,
No cursing of time.

(10) Anthem of Indian Children : ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیمؑ جس کے ، پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبیؑ کا آ کر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا

(9) Gazal : غزل

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت ، وہ نگہ کا تازیانہ
یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ ، نہ تراشِ آزرانہ
نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہان عجب جہاں ہے ، نہ قفس نہ آشیانہ
رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مۓ مغانہ
مرے ہم صغیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ
مرے خاک وخوں سے تو نے یہ جہان کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے ؟ تب و تابِ جاودانہ
تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا ، نہ شکایتِ زمانہ

کلیات (اردو) ، ص ۳۰۷

Ah ! don't you recall
Good old heart of mine ?
That college of love
Whip your eyes held,

These academicians
Demigoddesses of age
Have no Azar's art
Nor bewitching airs.

In this open space
There's no cosy nook
Queer is this world
Neither nest nor cage.

Vine is waiting for
Your bountiful rain
Persia's taverns sell
Magian wine no more.

There are several other worlds
Far beyond these petty stars
Love has yet to undergo
Many other ordeals.

Not breft of life are
These expansive spaces. Here
You will notice hundreds of
Caravans forging ahead.

Pray do not be centented
With this world of hue and scent.
Other gardens, other nests
Are there to welcome you.

If you are deprived of
One nest why should you bemoan ?
There are several other spots
To which grief can find its way.

You are a falcon, after all
Cut out to scale the heights,
There are newer heavens where
You may as well beat your wings.

Do nor let your feet be bound
By the chains of days and nights
You are destined to explore
Newer spaces, newer times.

Fled are times when I was
All alone in assembly
Now there are a number of
Confidents around me.

My tomb is the pilgrimage
Of the brave and steady souls
I've taught the poor dust
To soar like the Alvand.

Truth does not stand in need of
My role of a tiring maid.

For the loving care of
Nature dyes the tulip red.

---

(8) Ghazal : غزل

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روزوشب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

کلیات (اردو) ، ص ۲۵۲

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

کلیات (اردو) ، ص ۳۰۶

There is no wealth better than
Leaping flame and ache of love.

I won't barter prayer mat
With the highest throne of God.

Ah ! your freemen do not feel
At home in this world or next.

Here the bond of death irks them
And the bond of life in the next.

Your veil's bonanza for
Wanderers in the lane of love.

Your slow surrender does
Whet the fire of my love.

It passes its span of life
On the hills and in the sands.

For the hawk 'tis matter of
Utter shame to make a nest.

اقبال ! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

کلیات (اردو) ، ص ۸۳

Best of all the lands is our Hindustan
We its nightingales, 'tis our flowerbed.

When we are abrood our hearts are in Hind
Deem us to be there where our hearts throb,

Its highest mountain, neighbor of the sky
Is our sentinel, our unflinching guard.

Thousand rivers frisk in its loving lap
Which make paradise envy its orchard.

O Ganges ! can you remember those days
When our caravan landed on your banks ?

Religion does not teach maliciousness
We are all Hindis and Hind is our land.

Egypt, Greece and Rome all were wiped out
But our name and fame live upto this day.

There's something which makes us still survive
Though time has been long hostile to us.

'Iqbal' in this world confidant is none
How can anyone know my inner pain ?

---

(7) Ghazal : غزل

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی ، وہاں جینے کی پابندی

Hearts of all the devotees.
Strength and composure combine
In the chanting of devouts.
In love lies salvation
Of all people of the world.

---

(6) India's National Anthem : ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی ، یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم ، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی ، دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا ، وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آب رود گنگا ! وہ دن ہیں یاد تجھ کو ؟
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

All that you have learnt from them.
Is to hate your fellowmen.
E'en our God appears to teach.
Preachers to berate and chide.
Sick of your ways I've at last
Taken leave of fane N shrine.
I reject preacher's discourse
As well as your silly myths.
You have a fond belief that God
Live in images of stone.
But to me each speck of my
Country's dust is sacrosant.
Come, let us lift once again
Curtains that keep us apart.
Reunite the parted ones.
Blot out stigma of discord.
Habitat of the heart has been
Lying desolate for long.
Let us lay foundation stone
Of a new shrine in this land.
Let our holy place be higher
Than all spots of pilgrimage.
Let us make its lofty spires
Touch the hem of firmament.
Let us get up every morn
And sing honeyed melodies.
Pour the wine of love to touch

(5) New Shrine : نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا ، چھوڑے تیرے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیرت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں ، نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پریت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

کلیات (اردو) ، ص ۸۸

O Brahmin ! if you don't mind
May I tell the bitter truth ?
Idols which bedeck your shrine
Ah ! these are now out of date.

(4) Censure : گلہ

معلوم کسے ہند کی تقدیر گلہ اب تک
بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے

دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس گلہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھکو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

کلیات (اردو)، ص ۶۱۲

None can foretell your
Fate, o Hindustan !
Poor thing ! a bright
Gem in foreign crown.
Your yeoman's corpse,
Spewed up from the tomb,
Whose rotten shroud is
Still lying 'neath earth.
Soul and body pawned
To the foreigners.
Neither dwelling place
Nor dweller survives.
You agreed to be
Britain's servitor.
Britain I don't blame
It is you I chide.

One storey of heart's abode
May be some beloved guest
Poure into it from somewhere.

(3) India's Artists : ہنروران ہند

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشہ' تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ ، بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

کلیات (اردو) صفحہ ۵۹۰

Their fancy's deathbed
Of rapture and love.
Their unlit minds are
Peoles' cemeteries.
Image of death is
Painted in tbeir shrines.
Their art's sick of life
Like the pundit's soul.
They hide holy heights
From the human eye.
They put soul to sleep
And excite the flesh.
India's painters, poets
And tellers of tales
Woman sits astride
Their nerves, alas !

(f) سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

کلیات (فارسی) ، ص ۸۹۴

(f) Muse departed may or may not repair
You may breathe or not Hejaz's gentle air
Days of this faqir have come to an end
Some seer may or may not be his heir.

(g) تری دلیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دلیا فغانِ صبحگاہی
تری دلیا میں میں حکوم و مجبور
مری دلیا میں تیری پادشاہی

کلیات (اردو) ، ص ۴۷۸

(g) In your world the fish and fowl abound
Mine with sunup lament does resound
In your world I am just a poor serf
And in mine your supremacy's found.

(2) Beloved Guest : مہمان عزیز

ہر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و نا خوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
چاہیے خانہ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آ جائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز

کلیات (اردو) ، ص ۵۰۳

Minds of the School-bred people are
Meeting place of medley thoughts.
What is good and what is bad
Who can tell in our age ?
Better keep unoccupid

(c) ترے سینے میں دم ہے، دل نہیں ہے
ترا دم گرمیٔ محفل نہیں ہے
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

کلیات (اردو)، ص ۷۸۶

(c) In you there's breath, not the stirring soul
In rousing mahfil you can play no role
By pass reason for it is a candle which
Points out the way, not the final goal.

(d) نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی
کہ اصل زندگی ہے خود نمائی
نہ دریا کا زیاں ہے، نے گہر کا
دلِ دریا سے گوہر کی جدائی

کلیات (اردو)، ص ۶۷۴

(d) Of meeting and split nothing need he said
Self-unwrapping is life's fountain-head
Neither ocean is lesser nor the pearl
As the pearl departs from the ocean's bed.

(e) فراغت دے اسے کارِ جہاں سے
کہ چھوٹے ہر نفس کے امتحاں سے
ہوا پیری سے شیطاں کہنہ اندیش
گناہِ تازہ تر لائے کہاں سے

کلیات (اردو)، ص ۶۷۱

(e) Lord ! relieve him from day-to-day affairs
So that he is freed from momently cares
Age has turned Satan into old fogey
To commit new sins he not at all dares.

Rajinder Singh Verma

Iqbal for Everyone

(1) Quatrains رباعیات

(a) ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے ؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے ؟
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے ؟

کلیات (اردو) ، ص ۶۷۵

(*a*) Why do not tempests agitate your sea ?
Why your nature is marked by heresy ?
You keep complaining 'gainst what God ordained
Why don't you become yourself His decree ?

(b) غریبی میں ہوں محسودِ امیری
کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اس فقر و درویشی سے ، جس نے
مسلماں کو سکھا دی مرِ بزیری

کلیات (اردو) ، ص ۶۵۲

(*b*) My poor domain wealthy folk envy
For self-respecting is my poverty
That which undermines Musalman's will
Pray beware of such mendicancy.

enthusiasts of the Pakistan period are still alive. They include Dewan Azraf the Sansad's current chairman. If can also rely upon the support of a new generation of Urdn scholars in the universities and outside. Among them are such figures as Dr. Abdullah, Dr. Raisuddin, and Mrs. Kulsum of the University of Dacca, Dr. Syed Nuruddin. Advocate Abdul Jalil, Dr. Abeda Hafiz, a retired college principal, and several others who have responded enthuaiastically to the present revival of interest in Iqbal's works. There are many others who are less interested in Iqbal as a poet than in Iqbal as a Muslim thinker whose ideas on the reorganisation of Muslim society can be an inexhaustible source of inspiration to reformers. The birth and death anniversaries are again being celebrated and drawing large crowds. It can be said with confidence that the misunderstandings of the first few years of the seventies have for all practical purposes evaporated. Muslim Bengali is now entering upon a new phase in its approach to the poet unencumbered by political confusion. The Sansad hopes, its resources permitting to sponsor a new series of translations and also the republication of book on Iqbal not readily available now. It also proposes to collect newspaper articles on him published over the last half century, which apart from giving an idea of how various writers have reacted to Iqbal and also incidentally of changes in literary taste, will provide an interesting light on the climate of thought in the subcontinent as a whole.

---

a renaissance in Islam, as a champion of freedom, as a man who struggled all his life to teach man that he can best fulfil his destiny and potential by a dynamic response to the challenges of his existence, by throwing our sense of historical perspective to the winds. It is this realisation which crystallised in March 1986 into the formation by a group of Dacca University students and some others of the Iqbal Sansad. This was symptomatic of a change which in the meanwhile had taken place in the climate of thought in Bengladesh.

The Iqbal Sansad began its journey on a shoe-string budget It has yet no permanent home. But thanks to the untiring efforts of the young men behind it, the Sansad has so far succeeded in holding a number of celebrations and seminars on Iqbal, in publishing several booklets consisting of articles written by leading scholars and Iqbal admirers, and what is more important in collecting a thirteen hundred-volume library on the poet. These publications and celebration have once again focussed attention on the importance of Iqbal as a poet and thinker as a part of a cultural legacy that Bangladesh can ill-afford to abandon. The Sansad has had many frustrations and disapointments to contend with. Its motives are not always clearly understood. It has received no finacial backing from any important source : and it also faces problems from the fact that many of Iqbal's works and their translation are no longer available. But a welcome sign of the times has been the increasing sympathy shown towards its aims among an ever-widening circle among the educated. The Sansad looks forward to publishing in 1989 a volume in English to highlight the new response to Iqbal in a new context. The Sansad is a wholly non-political organisation devoted to the object of promoting the study of Iqbal.

The Sansad during the two and a half years of its existence has built up an organisational structure consisting of a council and body of advisers and has been able to establish contact with other societies interested in Iqbal. Despite the financial constraints under which it operates it has benefited from the fact that some of the Iqbal

(Iqbal as I know him). Muhammad Abdul Hai, who was Professor of Bengali in Dacca University, contributed a number of critical essays on Iqbal which were published in monthly periodicals in the late forties and later. Some of them deal with such subject as Iqbal's place as the national poet of Pakistan, his concept of the true Muslim, and the meaning of his message.

This account is by no means exhaustive. No record exists of the numerous essays which appeared farily regularly in the dailies and monthlies on the poet's birth and death anniversries which were observed without fail by enthusiastic groups of writers and readers. These meeting drew large crowds.

Iqbal was not only read and translated ; he exerted on a large number of creative writers an influence which is difficult to trace without an exhaustive exmination of the poetry and prose written during the forties, fifties and sixties. Farrukh Ahmad, a major Bengali poet in his own right, was an admirer and follower of Iqbal. The increased emphasis on the ideals of brotherhood among men that can be perceived in the poetry of Ghulam Mustafa and Shahadat Hussain is attribitable to Iqbal.

Among the prose writers who tried sedulously to explain Iqbal to the Bengali speaking audience the most prominent were Muhammad Wajed Ali, S.Wajed Ali. Dewan Mohammad Azraf and Hassn Zaman.

The unfortunate events which marked the birth of Bangladesh in 1971 led, as we have said to a misunderstanding about Iqbal's responsibility for what happened. The Iqbal Academy founded in the sixties by Mizanur Rahman could no longer function. Iqbal's name was removed from one of the residential halls of Dacca University owing to the same misunderstanding. Whatever the emotions of the crowd, the more perceptive sections of the Bangladeshi population have always realized that it was not right to deny Iqbal his due as a great creative artist and thinker, as a harbinger of

Mirza Sultan Ahmad published his translations of *Asrar-e-Khudi* and *Ramuz-e-Bekhudi* in 1954. In 1957 came *Kalam-e-Iqbal* by Ghulam Mustafa ; this was a translation of several poems commissioned by the Iqbal Academy.

This does not by any means exhaust the list of translators. For many pieces translated by individuals here and there were regularly published in different literary journals. These remain scattered and if collected would give a better idea of the popularity of Iqbal in Muslim Bengal. Among the translations of this kind Abdul Quadir's work, originally published in *Mahenau*, deserves a mention.

Iqbal's English writings, particularly his *Reconstruction of Religious Thought in Islam*, have also attracted translators. The first translation by one Abdul Huq appeared serially in the monthly *Mohammadi* in the early forties, to be followed soon afterwards by another incomplete translation by Mujibur Rahman of the *Azad*. In 1957 under auspices of the Pakistan Government a board of translators was set up for this work. A Bengali version entitled *Islame Dharmiya Chintar Punargathan*, edited by Ibrahim Khan and Sayeedur Rahman, was eventually published under the imprimatur of Pakistan Publication which was a semi-official organisation. Iqbal's thesis on Persian metaphysics is also available in Bengali in a version sponsored by the Islamic Foundation of Dacca. It is the most important translation of any work by Iqbal produced in the Bangladesh period.

Attempts to evaluate Iqbal critically in Bengali date back to 1945 when Dr Shahidullah wrote his monogram on the poet. About the same time or perhaps a year earlier in 1944 Habibullah Baha wrote a book on Iqbal in which he tried to underscore the significance of his message, They were followed by a critical work on the same subject by Syed Abdul Mannan who also published a translation of K.G. Saiyyidain's *Iqbal's Educational Philosophy* in 1958. Yet another book in which an attempt is made to interpret the poet is represented by Mrs Nur Jahan Begum's *Iqbalke Jatotuku Jenechhi*

Before I pass on to the translations of poems other than *Shikwa*, I shauld at this point mention an English translation of *Shikwa* and *Jawab-e-Shikwa* by Altaf Husain, a Bengali Muslim, who later rose to be first the chief editor of Dawn and afterwards a minister in the Pakistan cabinet. His version was published some time before the establishment of Pakistan and I personally think it is superior to the translation of the same work by Professor Arberry. Altaf Husain's quatrains caught some of the fervour of the original.

Syed Abdul Mannan's renderings of selections from Iqbal were published in 1945. He was the second person to attempt a translation of *Asrar-e-Khudi*, having been preceded by Abdul Majid.

Another landmark in the interpretation of Iqbal was the appearance in 1952 of a volume entitled *Iqbaler Kabita* or Iqbal's poems written jointly by Farrukh Ahmed, Abul Hussain and Syed Ali Ahsan. The book included fragments from *Asrar-e-Khudi*. They relied mainly on an English translation of that work by Professor Nicholson.

Among those in the Pakistan period who translated directly from the original special mention must be made of two writers: A. F. M. Abdul Huq and Maniruddin Yusuf. Abdul Huq was not a poet himself, but he brought to his rendering of *Ramuz-e-Bekhudi* an impressive knowledge of Persian. Yusuf not only was a good poet in his own right but came from a family who spoke Urdu at home and were descended from a line of well-known Persian scholars. Yusuf knew both of these languages. His *Iqbaler Kavya Sanchayan* or Selections from Iqbal covers a wide range of Iqbal's works and presents Iqbal in language which is poetical at the same time that it conveys some of the flavour of Urdu and Persian idiom. The works represented in the volume include *Bang-e-Dara*, *Bal-e-Jibril*, *Zarb-e-Kalim* and *Armughan-e-Hijaz*. Yusuf's translations have won a permanent niche in the history of Bengali poetry. They can be read and enjoyed as original verse.

as early as 1928 and was published in a monthly called *Sahityik*. Kalimullah was, at the time he translated the work a student in a Higher Secondary College. His work has less merit as poetry than the translation done by Ashraf Ali Khan, a poet himself, in the thirties. Ashraf Ali was a fiery young man whose enthusiasm for Islam paralleled Iqbal's, though, needless to say, he did not possess Iqbal's stature as a scholar. The third translation, by Dr. Muhammad Shahidullah, the celebrated Bengali scholar, came out in 1940. It lacks Ashraf Ali Khan's poetic fervour but is more literal and faithful.

Shikwah and Jawab-e-Shikwah attracted more than a half-dozen translators in the Pakistan period. Immediately before the establishment of Pakistan came two translations, one by Aminuddin Ahmed and the other by Muhammad Sultan and they were followed by a regular cascade of translations, The most famous among them was the version done by the well-known poet Ghulam Mustafa in 1960. This was preceded by Abul Kalam Mustafa's work in 1952.

It may not be out of place to mention that Muhammad Sultan's translation carried a brief foreword by Kazi Nazrul Islam, Muslim Bengal's greatest poet, who termed it a remarkable achievement which fully communicated the flavour of the original.

The year 1960 saw also a new translation by Mizanur Rahman who was responsible for the founding of the Iqbal Academy later. Mention must be made among the admirers of Iqbal of the work of Moulavi Tamizuddin, Kazi Akram Husain and Bazlur Rahman. All these versiors appeared before the fall of Pakistan in 1971.

Bang-i-Dara was first introduced to Bengali readers by Mizanur Rahman in 1960 along with his version of *Shikwah* in an anthology entitled *Iqbaler Katha*. It included selections from that work and was given the general title of *Iqbalika* which means an Iqbal anthology.

a group of enthusiastic university students in Dacca that phase can be said to have definitely come to an end.

Urdu and Persian used to be studied and cultivated fairly widely in pre-1947 Bengal. Nineteenth century Bengal produced in Abdul Ghafur Nassakh an eminent poet whose mother tongue was Bengali but who wrote with remarkable mastery in both Urdu and Persian. He was a contemporary of Hali and was known and respected in literary circles in Lucknow and Delhi. His elder brother Nawab Abdul Latif was a famous man whose contribution to Muslim education and politics is well-known. This tradition did not die out completely with the end of the century. I myself knew in my own childhood a large number of people in Dacca who could hold their own against schotars in Northern India.

Now, Iqbal owed his popularity in Bengal not only to the fact that there existed here a tradition of Urdu and Persian scholarship but to his revolutionary interpretation of the message of Islam. The way he transmuted his enthusiasm for Islam into great poetry set him apart from all others. His boldness an as advocate of this religion espacially the emphasis he placed on the unity of the Islamic community worldwide. his belief that Islamic brotherhood offered a better alternative to modern nationalism, the dynamism of his philosophy of salfhood had a special effect on the Muslims of Bengal. They had been groaning for decades since the beginning of British rule under a double yoke, the yoke of political bondage joined to the yoke of cultural bondage which had resulted from the new system of education. Having boycotted it initially they found themselves left high and dry a great distance from their Hindu neighbours. Iqbal brougt them promise of fresh hope, and pointed to a way out of despair. Not unnaturally, the first book to be widely studied and translated into Bengali was Iqbal's *Shikwah o Jawab-a-Shikwah.* This was both an analysis of the misfortunes which afflicted the Muslim community and an attempt to discover a remedy. The earliest translation, by H. Kalimullah, appeared

Dr. Syed Sajjad Husain

Iqbal in Muslim Bengal

The study of Iqbal in Muslim Bengal seems to have begun almost as soon as he established himself as a poet in Northern and Western India, but it is possible to distinguish three phases in the approach of Bengali speaking Muslims to the poet : the period before 1947 when the British still governed the subcontinent : the Pakistani period from 1947 to 1971 : and the period from 1972 until the present day. Except for a brief interregnum following the emergence of Bangladesh as an independent state in 1971 when temporary political passions made it difficult for anyone to cultivate Iqbal openly and led to the removal of his name from institutions associated with him, including the Dacca University Hall which used to be called Iqbal Hall, there has actually been never a time when he was totally forgotten. The reaction against him in the wake of the tragic events of 1971 was due to the mistaken idea that having been the originator of the concept of Pakistan the poet was somehow responsible for the sufferings which marked the establishment of Bangladesh. But it is doubtful whether the feeling was shared by thoughtful people everywhere. No attempt was made to remove Iqbal's works from the syllabuses of the Urdu departments in the universities, nor was the sale of Iqbal's poems banned. He continued to be studied in private by many, although celebrations of his birth and death anniversaries ceased temporaily. With the eatablishment of the Allama Iqbal Sansad in the late eighties by

رُوح افزا پیجیے ۔ رُوح تازہ کیجیے

اس کے رنگ سے آنکھوں میں طراوت، خوشبو سے مشام جاں معطّر،
ذائقے سے دل و دماغ آسودہ اور تاثیر سے پورے وجود میں تازگی و توانائی کی لہر۔

رُوح افزا کی یہ ساری خوبیاں رُوح کی مسرّت کا باعث ہیں۔

رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں بے مثال

ہمدرد

رُوح افزا

مشروبِ مشرق

تعلیم ہماری دولت
اخلاق ہماری قوت

Adarts

HRA-4/89